مقالاتِ یومِ اقبال

جو

انٹر کالجییٹ مسلم برادرہڈ

کے زیرِ اہتمام

قومی کتب خانہ۔ ریلوے روڈ لاہور

نے شائع کئے

بارِ اوّل ۱۹۳۸ء قیمت

فہرست مضامین



تھدیہ

ان آنسوؤں کے نام جو ہزاروں انسانوں کی آنکھ سے اس پاکباز انسان کی یاد
میں بہہ رہے ہیں۔ جس کی یاد ابداً دل سے فراموش نہ ہوگی۔

مقدّمہ

یومِ اقبال منانے کا خیال نہ معلوم کس خاص ترٹپ اور دلنخروش جذبہ کے ماتحت نہانخانۂ دماغ سے نکلا کہ کچھ عرصے کے لئے اس تحریک کے سامنے ملک کی تمام علمی و ادبی تحریکیں ماند پڑ گئیں۔ ملک کا کوئی اخبار ایسا نہ ہوگا جس کے صفحات اس کے تذکرہ سے خالی ہوں۔ ملک کی کوئی ایسی علمی و ادبی انجمن نہ ہوگی جس میں اس تقریب کے منانے کی تحریک نہ ہوئی ہو ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو یہ تقریب ہندوستان کے کونے کونے میں پرجوش خلوص اور وجد آفریں شان و شکوہ سے منائی گئی۔ اخبارات کے ورق مدتوں یومِ اقبال کی کاروائیوں کے تذکرہ سے معمور رہے، خود ہمارے دفتر میں تبریک و تہنیت کے تاروں اور خطوں کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا۔ اور حضرت علامہ مرحوم کو تو دُنیا کے ہر کونے سے شاعروں، ادیبوں، سیاسی لیڈروں، یونیورسٹی کے وائس چانسلروں ریاستوں کے ولی عہدوں اور خود مختار حکومتوں کے نمائندوں کی طرف سے زندگی کی ۶۵ منزلیں طے کرنے پر مبارکبادی کے خطوط اور تار موصول ہوئے لیکن ان پرشوکت مظاہروں، بے نظیر اجتماعات، اخبارات کے لیڈنگ آرٹیکلوں، دُنیا کے بلند مرتبہ انسانوں کے ذاتی پیغامہائے تہنیت اور ایسے دوسرے مظاہروں کا اس پیکرِ حیا و استغنا پر کیا ردِ عمل ہؤا۔ اس کا اندازہ اس خط سے ہو سکتا ہے جو علامہ مرحوم نے ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب حیدر آباد دکن کے نام لکھا تھا، اور جس کے دوران میں آپ نے فرمایا کہ "وہ تقریب جسے یومِ اقبال کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس میں میرے لئے صرف یہ خیال باعثِ طمانیتِ قلب ہے کہ جس زمین میں مَیں نے اپنا بیج پھینکا ہے، وہ زمین شور نہیں ———"

یومِ اقبال منانے کا مقصد ایک اور صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ مشرق کے اس عدیم النظیر فلسفی اور شاعر کے ان انقلاب آفریں سیاسی، مذہبی اور تمدنی خیالات سے بہرہ اندوز ہونے کی کوشش کریں، جن کو عمل کے سانچے میں ڈھالے بغیر مغرب کے الحاد آفریں دَور کا طلسم نہیں ٹوٹ سکتا، اس لئے مشرق کا یہ سیاسی، مذہبی اور تمدنی تفوق (جو اقبال کے پیشِ نظر تھا) صرف ایک بار یومِ اقبال منانے سے حاصل نہیں ہو سکتا، بلکہ ہمیں اس تحریک کو اس وقت تک جاری رکھنا ہوگا جب تک ملک کی زیریں تہوں تک اس کے اثرات نہیں پہنچ جاتے، اور جن کا لازمی نتیجہ "عمل" کی صورت میں جلوہ گر ہوگا۔ چنانچہ انٹر کالجیئٹ مُسلم برادر ہُڈ ابھی سے اگلے سال یومِ اقبال منانے کی تیاریوں میں مشغول ہو چکی ہے۔

یہ مجموعہ جسے مختلف ناگزیر مجبوریوں کے ماتحت شائع کیا جا رہا ہے۔ سالِ اوّل کے یومِ اقبال کا پھل ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ بعض اہم مضامین تنگیٔ داماں کی وجہ سے زیبِ قرطاس ہونے سے رہ گئے، اور جو اُمید ہے کہ اس مجموعہ کی دُوسری جلد کی شکل اختیار کرلیں گے۔ اس موقعہ پر یہ ہمارا خوشگوار فرض ہے کہ ہم ملک کی ان علمی و ادبی انجمنوں کا تہِ دل سے شکریہ ادا کریں، جنہوں نے ہماری آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے ہاں یومِ اقبال کی تقریب کو شان و شوکت سے منایا۔ ہم ان شعرائے کرام اور ادبائے عظام کے بھی سپاس گزار ہیں جنہوں نے ہماری استدعا پر اس موقع کے لئے نظمیں اور مقالے لکھے، ہم ملک کی اُن چیدہ چیدہ بزرگوار ہستیوں کے بھی ممنونِ کرم ہیں جنہوں نے ہماری التجا پر ہمیں پیغامات ارسال فرما کر ہماری حوصلہ افزائی کی، اور جسے ملکی پریس خصوصاً ورنیکلر پریس نے اپنے صفحات میں نمایاں جگہ دی۔ ہمیں خواجہ غلام السیدین صاحب کے علاوہ دہلی کے اس قافلہ کے ارکان کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جو حضرت مولینا اسلم جیراجپوری کی زیرِ قیادت ملازمت اور دوسری مشغولیات کے باوجود یومِ اقبال میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لائے۔

ناشکرا پن ہوگی اگر اس موقع پر انٹر کالجئیٹ مسلم برادرہڈ کے پُرانے ارکان خصوصاً ڈاکٹر ملک عبدالحمید چودھری علی محمد خادم، ڈاکٹر چودھری رحمت اللہ، چودھری غلام محمد اور اقبال کمیٹی کے سرگرم سکرٹری مسٹر الطاف حسین شوکت کے تعاون کا اعتراف نہ کیا جائے، مؤخر الذکر نے اقبال کمیٹی کی تشکیل کے دن سے لے کر اس کتاب کے مکمل ہو جانے تک شب و روز کوششوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

محمد شفیع ایم۔ اے

صدر

ڈاکٹر اقبال کا علمِ کلام

از

سیّد سلیمان ندوی و عبد السّلام ندوی

علمِ کلام اُس علم کا نام ہے جس میں اسلامی عقائد کو دلائلِ عقلیہ سے ثابت کیا جاتا ہے۔ لیکن ایران میں جب شاعری نے بہت زیادہ ترقی کی تو وہ صرف اپنے ہی دائرے یعنی جذبات ہی میں محدود نہیں رہی بلکہ فلسفہ، اخلاق، تصوف اور شریعت کے بہت سے مسائل بھی اُس میں داخل ہو گئے، اور ایرانی شعراء نے ان مسائل کو عقلی دلائل کے بجائے خطابی اور شاعرانہ دلائل سے اس خوبی کے ساتھ ثابت کیا کہ اُن کا طرزِ بیان ہمارے قدیم علمِ کلام کے عقلی دلائل سے زیادہ مؤثر اور دل نشین ثابت ہوا۔ حکیم سنائی، سحابی، صائب، عرفی اور بہت سے صوفی شعراء کے کلام میں اس قسم کے حقائق و مسائل نہایت کثرت سے ملتے ہیں، بالخصوص مولانا روم نے اپنی مثنوی میں اخلاق و تصوّف کے ساتھ تقریباً علمِ کلام کے تمام اہم مسائل کو نہایت دلآویز طریقہ پر بیان کیا ہے۔

اُردو شاعری کی بنیاد اگرچہ فارسی شاعری کی سطح پر رکھی گئی لیکن افسوس ہے کہ ہمارے شعراء نے فارسی شاعری کی نقل نہایت نامکمل طور پر کی اور علمِ کلام اور فلسفہ کے اُن مسائل کو بہت کم ہاتھ لگایا جو ایران کے صوفی شعراء کے کلام میں بہ کثرت موجود تھے، اُردو زبان کے شعراء میں اکبر کو چھوڑ کر صرف ڈاکٹر اقبال

ایک ایسے شخص ہیں جنہوں نے غزل و قصائد کے تنگ و تاریک کوچے سے نکل کر حقائق کے میدان میں قدم رکھا اور تصوف، اخلاق، فلسفہ اور اسرارِ شریعت کے بکثرت مسائل کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا، چنانچہ اس قسم کے مسائل میں سے اس وقت ہم علمِ کلام کے چند مسائل کو لے کر یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے موجودہ دَور کے رجحان و مذاق کے مطابق ان مسائل کی تشریح کس خوبی کے ساتھ کی ہے۔

قدیم زمانے میں جس طرح فلسفہ و سائنس کے مسائل عقلی دلائل سے ثابت کیے جاتے تھے، بعینہٖ اسی طرح ہمارے متکلمین نے اسلامی عقائد مثلاً وجودِ باری، توحید، نبوت اور حشر و نشر وغیرہ کا اثبات عقلی دلائل سے کیا، لیکن ان دلائل سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ توحید، نبوت اور رسالت وغیرہ کے عملی نتائج اس دُنیا میں کیا ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ امام غزالی، اور امام رازی وغیرہ نے اس روش کو چھوڑ کر نظری و عملی نتائج سے نبوت اور رسالت کا اثبات کیا، ہمارے صوفی شعراء بالخصوص حکیم سنائی اور مولانا رومی نے شاعرانہ و خطابی دلائل سے ان مسائل کے طریقۂ اثبات کو زیادہ مؤثر، دلنشین اور قریب الفہم بنا دیا۔ اس لئے موجودہ دَور میں یہ طریقۂ اثبات کافی نہیں ہو سکتا۔ یہ زمانہ ایک نئے تمدن و تہذیب کی ترقی کا زمانہ ہے، اور اس زمانہ میں کسی مسئلہ کی صرف نظری حیثیت پر نگاہ نہیں ڈالی جاتی بلکہ عملی حیثیت سے اُن کے نتائج و مظاہر پر نظر ڈالی جاتی ہے، اس زمانے میں سائنس کو جو مقبولیت حاصل ہے اُس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ وہ نہایت آسانی سے ہوا کو پانی اور پانی کو ہوا بنا دیتی ہے، بلکہ اُس کی وجہ یہ ہے، کہ آج دُنیا کی تمام کل سائنس ہی کی بدولت چل رہی ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی شاعری نے اسی تمدن، اسی تہذیب، اور اسی فضا میں بال و پر کھولے ہیں، اس لئے انہوں نے اسلامی عقائد کا اثبات زیادہ تر اُن کے عملی نتائج سے کیا ہے، اور خودی کا جو فلسفہ اُن کا مخصوص فلسفہ ہے، اُس سے اُنہوں نے ان

مسائل کی تشریح و اثبات میں بھی کام لیا ہے، اس لئے اُن کا طرزِ بیان قدیم علمائے کلام اور قدیم متکلم صوفی شعراء کے اندازِ بیان سے زیادہ اس زمانے کے رُجحان و مذاق کے مطابق ہے، اور ہم اسی رُجحان و مذاق کے مطابق اُن کے علمِ کلام پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔

توحیدِ باری

نظری حیثیت سے توحیدِ باری کا مفہوم اس سے زیادہ نہیں کہ صرف ایک خدا کے وجود پر اعتقاد رکھا جائے، لیکن عملی حیثیت سے جب تک توحید کے ماننے والوں میں عملی اتحاد نہ ہو محض یہ اعتقاد نا کافی ہے، اور اس سے کوئی متحدہ تہذیب متحدہ تمدن متحدہ معاشرت اور متحدہ نظامِ اخلاق نہیں پیدا ہو سکتا، اگر تمام مسلمانوں کا طریقہ نماز متحد نہ ہو اور سب کے سب اپنا قبلہ الگ الگ بنالیں تو مسلمانوں میں یہ وحدت و یک رنگی نہیں پیدا ہو سکتی، جن یونانی حکماء نے وحدت الوجود کا مسئلہ ایجاد کیا تھا اُن کا مقصد بھی یہی تھا کہ تمام دُنیا متحد ہو جائے اور ہر قسم کے اختلافات مٹ جائیں، اسلامی توحید کا مقصد بھی اسی قسم کی یک رنگی کا پیدا کرنا تھا، لیکن زمانہ مابعد میں اگرچہ تمام اسلامی فرقے اجمالاً عقیدۂ توحید پر متفق رہے، تاہم فقہی اختلافات نے ان کے اعمال میں ناہمواری پیدا کردی، اس لئے مسلمانوں میں وہ اتحادِ عمل باقی نہیں رہا جو دورِ صحابہ میں موجود تھا، اس لئے اگر محض اتحادِ عمل کو توحید کا حقیقی مظہر قرار دیا جاوے تو صحابہ کی توحید موجودہ دور کے حنفیوں، شافعیوں، مالکیوں اور حنبلیوں سے زیادہ مکمل و مستحکم ثابت ہوگی، ڈاکٹر اقبال نے توحیدِ باری کی بنیاد اسی عملی اتحاد پر رکھی ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے توحید پر جو غیر معمولی زور دیا ہے اُس کا مقصد مسلمانوں میں صرف اتحادِ عمل پیدا کرنا تھا، اگر آج مسلمانوں میں اتحادِ عمل نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اُن میں توحید یا کم از کم کامل توحید کے ماننے والے نہیں ہیں، اور اسی حیثیت سے اُنہوں نے توحید کے

متعلق فقہا و متکلّمین دونوں پر اعتراض کیا ہے:۔

زندہ قوّت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی　　آج کیا ہے؛ فقط اک مسئلۂ علمِ کلام
روشن اس ضَو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو　　خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
مَیں نے اے میرِ سپہ تیری سپہ دیکھی ہے　　قل ہو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام
آہ! اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہ　　وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے؛　　اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

ان اشعار سے معلوم ہُوا کہ توحید وحدتِ افکار اور وحدتِ کردار کے مجموعے کا نام ہے۔ مکی زندگی میں رسول اللہ صلعم نے توحید کی جو تعلیم دی اُس کا تعلق صرف وحدتِ افکار سے تھا، لیکن اس تعلیم نے جب ایک چھوٹی سی متحد الخیال جماعت پیدا کر دی تو آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور یہیں فرائض و احکام کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں، اور وحدتِ کردار کا دَور شروع ہوا، اور اسی وحدتِ کردار سے مسلمانوں کی عملی زندگی شروع ہوئی، اور اُنھوں نے مشرکانِ عرب، نصارئے روم اور یہودیانِ خیبر کی طاقت کو پاش پاش کر کے اپنا ایک متحدہ نظامِ سلطنت قائم کر لیا اور ایک زندہ قوم بن گئے، اس لئے ڈاکٹر اقبال کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ؎

زندہ قوّت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی　　آج کیا ہے؛ فقط اک مسئلۂ علمِ کلام

اسلام کی یہ توحید درحقیقت ایک جذباتی چیز تھی اور دُنیا کی کل جذبات ہی سے چلتی ہے، لیکن متکلمین و فقہا نے اس کو محض ایک عقلی چیز بنا دیا، اس لئے اس سے قدرتی طور پر انحطاط کا دَور شروع ہو گیا، اسی نکتے کو ڈاکٹر اقبال نے پیامِ مشرق میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

همائے علم تا افتد بدامت — یقیں کم کُن، گرفتارِ شکے باش
عمل خواہی یقیں را پختہ تر کُن — یکے جوئے و یکے بین و یکے باش

خدا کسی جہت میں نہیں

علمِ کلام کا یہ ایک متداول مسئلہ ہے، اور معتزلہ و اشاعرہ دونوں اس پر متفق ہیں کہ خداوند تعالیٰ چونکہ مادی کثافتوں سے پاک ہے، اس لئے ذو جہت اور ذو اشارہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا نہ کوئی حیّز ہے نہ مکان بلکہ وہ زمان و مکان کی قید سے بالکل آزاد ہے لیکن علمِ کلام میں یہ مسئلہ بالکل خشک اور بے اثر طریقے پر بیان کیا گیا ہے جس سے انسان کی بلند ہمتی اور جوشِ عمل کا اظہار بالکل نہیں ہوتا، لیکن ڈاکٹر اقبال نے اس خشک مسئلہ کو اپنے شاعرانہ زورِ بیان سے ایک نہایت پُرجوش عملی مسئلہ بنا دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ دُنیا و آخرت میں جو کچھ ہے وہ تو انسان کے زورِ بازو کا نتیجہ ہے، اس لئے جس طاقت نے انسان جیسی پُرزور طاقت پیدا کی ہے، اُس کا مرتبہ تو اس سے کہیں بالاتر ہوگا: ؎

ایں جہاں چیست؟ صنم خانۂ پندارِ من است — جلوۂ او گروِ دیدۂ بیدارِ من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بہ نگاہے او را — حلقہ ہست کہ از گردشِ پرکارِ من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من — چہ زمان و چہ مکاں شوخیِ افکارِ من است
از فسوں کاریِ دل سیر و سکوں، غیب و حضور — ایں کہ غمّاز و کشائندۂ اسرارِ من است
آں جہانے کہ درو کاشتہ را مے دروند — نور و نارش ہمہ از سبحہ و زنّارِ من است
ساز تقدیرم و صد نغمۂ پنہاں دارم — ہر کجا زخمۂ اندیشہ رسد تارِ من است

اے من از فیضِ تو پائندہ نشانِ تو کجاست؟

ایں دو گیتی اثرِ ماست، جہانِ تو کجا است؟

عدمِ رویتِ باری

اشاعرہ رویتِ باری کے قائل اور معتزلہ اُس کے منکر ہیں لیکن دونوں کا طرزِ استدلال بالکل عقلی ہے جس سے جذبہ اور قوتِ عمل کو کوئی تحریک نہیں ہوتی، ڈاکٹر اقبال نے اس مسئلے میں معتزلہ کا عقیدہ اختیار کیا ہے، لیکن یہاں بھی اُنہوں نے انسان کے شرف اور اُس کی قوتِ عمل کے مظاہر کو نظر انداز نہیں کیا ہے، بلکہ وہ کہتے ہیں کہ دُنیا کے سپید و سیاہ، دریا وکوہ، دشت و در اور مہر و ماہ سب انسان نے پیدا کیے ہیں یا یہ کہ وہ انسان کے لئے پیدا کیے گئے ہیں، اس لئے وہ انہی چیزوں کا گرویدہ و شیدائی ہے لیکن بلند ہمتی کا اقتضاء یہ ہے کہ نگاہ کو اس سے بھی زیادہ بلند کیا جائے اور اُس ذات کی تلاش کی جائے جو نگاہ کی گرفت ہی میں نہیں آسکتی ؎

نور تو وانمود سپید و سیاہ را　　دریا وکوہ، دشت و در و مہر و ماہ را
تو در ہوائے آنکہ نگہ آشنائے اوست　　من در تلاشِ آں کہ نتابد نگاہ را

نبوّت

علمِ کلام میں نبوت کا اثبات عام طور پر معجزات کے ذریعہ سے کیا گیا ہے، لیکن چونکہ عقلی حیثیت سے یہ طریقہ شکوک و شبہات سے خالی نہ تھا، اس لئے امام غزالی، امام رازی اور مولانا روم وغیرہ نے پیغمبروں کی تعلیمات اور اُن تعلیمات کے بہترین نتائج یعنی تزکیہ نفس اور تہذیب اخلاق وغیرہ کے ذریعے سے اس کا اثبات کیا لیکن ڈاکٹر اقبال نے نبوت کے اثبات کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ ان سب سے الگ اور موجودہ دَور کے ذوق و رُجحان کے بالکل مطابق ہے، نبوت کے اثبات کا جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے اُس کی بُنیاد یہ ہے کہ نبوت ایک غیر معمولی چیز ہے اس لئے اُس کی وجہِ ثبوت کو بھی غیر معمولی ہونا چاہئے، اور معجزہ چونکہ ایک مافوق الفطرت اور غیر معمولی چیز ہے، اس لئے اشاعرہ نے

اسی کو نبوت کی دلیل قرار دیا۔ لیکن اس دلیل پر جب بہت سے عقلی اعتراضات ہوئے تو امام غزالی وغیرہ نے پیغمبروں کی تعلیمات اور اُن کے نتائج کو نبوت کا معجزہ قرار دیا کیونکہ جادوگروں اور شعبدہ بازوں سے بھی اگرچہ بہت سے غیر معمولی اور مافوق الفطرت واقعات سرزد ہو سکتے ہیں، لیکن جہاں تک تجربہ کا تعلق ہے وہ خود نہ پیغمبروں کی طرح پاکیزہ اخلاق ہو سکتے ہیں، نہ اعلیٰ درجہ کی اخلاقی اور عملی تعلیم دے سکتے ہیں لیکن ڈاکٹر اقبال کے نزدیک ایک قوم کا پیدا کرنا نبوت کا سب سے بڑا معجزہ ہے، بالخصوص اس زمانے کے قومی ہنگامہ رستخیز میں نبوت کے ثبوت میں اسی معجزہ کو پیش کیا جا سکتا ہے، ساحروں اور شعبدہ بازوں سے اگرچہ بہت سے حیرت انگیز واقعات سرزد ہو سکتے ہیں لیکن آج تک کسی ساحر اور شعبدہ باز نے کسی زندہ قوم کو نہیں پیدا کیا، فرعون کے جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا مقابلہ تو ضرور کیا لیکن وہ یہودیوں جیسی قوم نہ پیدا کر سکے ؎

گفتم از پیغمبری ہم باز گوے ۔۔۔ سرّ او با مرد محرم باز گوے

گفت دو اقوام و ملل آیات اوست ۔۔۔ عصر ہاے ما ز مخلوقات اوست

از دمِ او ناطق آمد سنگ و خشت ۔۔۔ ما ہمہ مانندِ حاصل او چو کشت

ہاے و ہوے اندرونِ کائنات ۔۔۔ از لب او نجم و نور و نازعات

صوفیوں نے خلوت گزینی، ترکِ دُنیا، اور زہد و قناعت اور اسی قسم کے دوسرے محاسن اخلاق پر قناعت کر لی، لیکن پیغمبروں نے اس قسم کے محاسن اخلاق اختیار کر کے ایک زندہ قوم اور ایک نیا عالم پیدا کر دیا، اس لئے زہد و تقشف اور رسالت و نبوت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ؎

از وجودش اعتبارِ ممکنات ۔۔۔ اعتدالِ او عیارِ ممکنات

من چہ گریم از یم بے ساحلش | غرق اعصار و دہور اندر دلش
آنچہ در آدم نگنجد عالم است | آنچہ در عالم نگنجد آدم است
آشکارا مہر و مہ از جلوتش | نیست رہ جبریل را در خلوتش
مصطفےٰ اندر حرا خلوت گزید | مدتے جز خویشتن کس را ندید
نقش ما را در دلِ او ریختند | ملتے از خلوتش انگیختند

مظاہرِ عالم مثلاً آفتاب و ماہتاب، اور کوہ و دشت وغیرہ سے خدا کے وجود اور قدرت پر جو استدلال کیا جاتا ہے ایک مادہ پرست اُس کا انکار کرسکتا ہے اور ان کو قوانینِ فطرت کا نتیجہ قرار دے سکتا ہے، لیکن قوموں کی تولید و نشو و نما بہر حال قوانینِ فطرت کا نتیجہ نہیں، بلکہ وہ انبیاء کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے، اس لئے خدا کے وجود کا تو انکار کیا جاسکتا ہے، لیکن نبوت کا انکار نہیں کیا جاسکتا ؎

میتوانی منکرِ یزداں شدن | منکر از شانِ نبی نتواں شدن

ہجرت

اسی سلسلے میں ڈاکٹر اقبال نے اُس مشہور اعتراض کا جواب دیا ہے جو رسول اللہ صلعم کی ہجرت پر کیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت دشمنوں سے ایک فرار کی صورت تھی، اور اس قسم کی بزدلی ایک اولوالعزم پیغمبر کی شایانِ شان نہیں، علامۂ ابن قیم نے لکھا ہے کہ یہ بزدلی نہیں بلکہ جرأت و ہمت تھی، اور ہجرت جہاد کا مقدمہ و اعلان تھی، لیکن ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں کہ چونکہ رسول اللہ صلعم کا مقصد ایک ایسی عالمگیر ملت کا پیدا کرنا تھا جو وطنیت کی قوم سے آزاد ہو، اس لئے آپ نے مکہ سے نکل کر مدینہ میں اسی قسم کی قوم پیدا کی اور وطنیت کا خاتمہ کردیا ؎

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست | بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست رومی و شامی گِلِ اندامِ ماست
قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست مرز و بومِ او بجز اسلام نیست
عقدۂ قومیتِ مسلم کشود از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد بر اساسِ کلمہ تعمیر کرد
پس چرا از مسکنِ آبا گریخت؟ تو گماں داری کہ از اعدا گریخت؟
قصہ گویان حق ز ما پوشیدہ اند معنیٔ ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است این ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
معنیٔ او از تنک آبی رم است ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است
بگذر از گل گلستاں مقصودِ تست این زیاں پیرایۂ بندِ سودِ تست

معراج معراج کے جسمانی اور روحانی ہونے کی بحث نہایت فرسودہ و پامال ہے، اور ڈاکٹر اقبال اس فرسودہ و پامال بحث میں پڑنا نہیں چاہتے، تاہم اُن کے نزدیک دُنیا کے تمام واقعات صرف مادی علل و اسباب کے پابند نہیں ہیں، بلکہ روحانی طاقت بھی بہت سے واقعات کا سبب بن سکتی ہے، اور معراج خواہ جسمانی ہو یا روحانی لیکن وُہ بہرحال ایک رُوحانی طاقت کا نتیجہ تھی، اس لئے بذاتِ خود وہ ایک رُوحانی چیز تھی اور جسمانی حالت میں بھی روحانی طاقت اُس کی محرک تھی۔ ؎

اے ولولۂ شوق جسے لذّتِ پرواز کرسکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج
مشکل نہیں یارانِ چمن معرکۂ باز پُرسوز اگر ہو نفسِ سینۂ دُراج
ناوک ہے مسلماں، ہدف اس کا ہے ثریا ہے سرِّ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج

تو معنیٔ 'والنجم' نہ سمجھا تو عجب کیا ہے تیرا مدوجزر ابھی چاند کا محتاج

علمِ کلام میں یہ ایک خشک اور بے اثر مسئلہ تھا لیکن ڈاکٹر اقبال نے اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو روحانی طاقت کی نشوونما اور بلند ہمتی کا سبق دیا ہے۔

وحی والہام

ڈاکٹر اقبال کے نزدیک بُرے بھلے کی تمیز صرف عقل سے نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کے لئے وحی والہام کی ضرورت ہے، لیکن جس طرح انسان قوتِ ذائقہ سے لذیذ وغیر لذیذ کھانے کا اور قوتِ لامسہ کے ذریعہ سے نرم وسخت جسم کا احساس کرسکتا ہے بعینہٖ اسی طرح انسان کے اندر ایک قوت ہے جو اچھے اور بُرے کاموں کی تمیز کرسکتی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اور قوتیں صرف مادیات سے تعلق رکھتی ہیں، اور یہ قوت روحانیات سے تعلق رکھتی ہے، لیکن بہرحال زندگی کی نشوونما کے لئے یہ قوت خود زندگی ہی کے اندر موجود ہے۔ ؎

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں راہبر ہو ظن وتخمین تو زبوں کارِ حیات

فکر بے نور ترا، جذب عمل بے بنیاد سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات

خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیونکر گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات

جس طرح ذوقی چیزوں کی تمیز میں عقل بالکل بیکار ہو جاتی ہے، صاف وشفاف پانی کو دیکھ کر صرف عقل یہ فیصلہ نہیں کرسکتی کہ وہ شور ہے یا شیریں؛ اس کا فیصلہ صرف ذوق کرسکتا ہے، اسی طرح بہت سے افعال کے حُسن وقبح کا فیصلہ بھی عقل نہیں کرسکتی، بلکہ خود زندگی ہی یہ فیصلہ کرسکتی ہے کہ کون سے افعال زندگی کے لئے موزوں ہیں اور کون سے غیر موزوں؛ اسی ذوقی احساس کا نام وحی یا الہام ہے، باقی رہا وحی والہام کی حالت میں آواز کا آنا، فرشتے کی شکل کا نظر آنا، ڈاکٹر اقبال اس کے نہ منکر ہیں نہ مقر،

ممکن ہے کہ جس طرح بھوک، پیاس اور دوسرے جسمانی احساسات میں انسان پر خاص خاص حالات طاری ہوتے ہیں، اسی طرح رُوحانی احساسات میں بھی انسان پر مختلف کیفیتیں طاری ہوتی ہوں۔

مسئلہ خیر و شر

مذہب و اخلاق، وحی و الہام، امر و نہی اور عذاب و ثواب سب کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ دُنیا میں بُرائیاں اور بھلائیاں دونوں موجود ہیں، اگر یہ دونوں چیزیں موجود نہ ہوتیں تو مذہب و اخلاق کی کوئی ضرورت نہ ہوتی، خیر و شر کی یہ آمیزش سب سے زیادہ انسانی فطرت میں پائی جاتی ہے، اسی لئے وہ مذہب کا اصلی مخاطب اور مکلّف ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ خدا نے انسان کی فطرت ہی ایسی کیوں بنائی جس سے بُرائی سرزد ہو، کیا یہ ممکن نہ تھا کہ انسان فطرۃً ایسا بنایا جاتا جس سے بُرائی سرزد ہی نہ ہوتی؟ متکلمین نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ انسان کی اصل فطرت میں اگرچہ بُرائی کا مادہ بھی موجود ہے تاہم اُس میں نیکی کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے، اور انصاف و حکمت کا اقتضا یہی ہے، لیکن ڈاکٹر اقبال کے نزدیک نیکی و بدی دونوں میں توازن پایا جاتا ہے اور انسان میں دونوں کی مقدار برابر برابر موجود ہے، اور دُنیا کی رونق دُنیا کا ہنگامہ اور دُنیا کی شان و شوکت اسی توازن سے قائم ہیں، چنانچہ انھوں نے خدا اور انسان کے درمیان ایک مکالمہ لکھا ہے جس میں خدا نے انسان پر صرف بُرائی کا الزام لگایا ہے ؎

جہاں را زیک آب و گل آفریدم　　تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولاد ناب آفریدم　　تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

لیکن انسان نے اس کے جواب میں ان برائیوں کا انکار نہیں کیا ہے بلکہ ان کے مقابل میں اپنی بھلائیاں گنائی ہیں ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

انھوں نے زبورِ عجم میں اس توازن کو اور بھی زیادہ نمایاں کیا ہے ؎

دلِ بے قیدِ من با نورِ ایماں کافری کرد
حرم را سجدہ آوردہ بتاں را چاکری کردہ
متاعِ طاعتِ خود را ترازو ئے برافرازد
ببازارِ قیامت با خدا سوداگری کردہ
زمین و آسماں را برمرادِ خویش میخواہد
غبارِ راہ و با تقدیرِ یزداں داوری کردہ
گہے با حق در آمیزد گہے با حق در آویزد
زمانے حیدری کردہ زمانے خیبری کردہ

لیکن اسی کے ساتھ اس سے انسان کے شرف کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا ؎

باین بیرنگیٔ جوہر از و نیرنگ میریزد
کلیسے بین کہ ہم پیغمبری ہم ساحری کردہ

کیونکہ باوجود خیر و شر کے اس مساویانہ امتزاج کے خیر کے نتائج زیادہ واضح و نمایاں ہوتے ہیں، انسان میں پیغمبرانہ اور ساحرانہ قوتیں اگرچہ مساوی مقدار میں ہیں، لیکن پیغمبرانہ طاقت کے جو نتائج ہیں اُن کے سامنے ساحرانہ طاقت کے نتائج بالکل ہیچ ہیں یا کم از کم یہ کہ قوتِ شر سے جو نتائج بد پیدا ہوتے ہیں انسان قوتِ خیر سے اُن کی تلافی کر دیتا ہے : ؎

نگاہش عقل دور اندیش را ذوقِ جنون دادہ ــــــ ولیکن با جنونِ فتنہ ساماں نشتری کردہ

قرآن مجید سے بھی خیر و شر کا یہی توازن ثابت ہوتا ہے، فرشتوں نے حضرت آدم کی خلافت پر صرف قوت شر کی وجہ سے اعتراض کیا تھا:۔

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ (تو فرشتے) بولے کیا تو زمین میں ایسے شخص (کو نائب) بناتا ہے جو اس میں فساد پھیلائے اور خونریزیاں کرے۔

لیکن خدا نے نہ اس قوت کا انکار کیا اور نہ یہ بتایا کہ انسان میں قوتِ خیر قوتِ شر پر غالب ہے بلکہ اس کے مقابل میں صرف اس کی بھلائی کا پہلو رکھ دیا:۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ اور آدم کو سب (چیزوں کے) نام بتا دیئے۔ پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے روبرو پیش کر کے فرمایا کہ اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو ہم کو (ان چیزوں کے) نام بتاؤ۔

مسئلہ تقدیر

اسلام میں مسئلہ تقدیر نے دو قسم کی عملی گمراہیاں پیدا کر دی تھیں، کچھ لوگ تو تمام اعمال و عبادات کو اس لئے چھوڑ بیٹھے تھے کہ دوزخ و جنت جو بھی تقدیر میں لکھی جا چکی ہے وہ تو لازمی طور پر ملے گی اس لئے اعمال و عبادات سے کیا فائدہ؛ لیکن ڈاکٹر اقبال نے بتایا کہ یہ خیال انسان کے عملی شرف کو کھو دیتا ہے، اور اس کو نباتات و جمادات کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے ؎

پابندیٔ تقدیر کہ پابندیٔ احکام؟ ــــــ یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مردِ خردمند
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر ــــــ ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش، ابھی خورسند

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

کچھ لوگ ہر قسم کے رندانہ اور اوباشانہ افعال کرتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ مشیتِ ایزدی نے ہم کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہے، خواجہ حافظ کے فلسفہ لذت پرستی کی بنیاد اسی تخیل پر ہے ؎

مرا روزِ ازل کارے بجز رندی نفرمودند ہر آں قسمت کہ آں جا شد کم و افزوں نخواہد شد

برو اے ناصح و بر دردکشاں خردہ مگیر کار فرمائے قدر میکند این من چہ کنم

لیکن ڈاکٹر اقبال نے ایک مکالمے میں جو خدا اور ابلیس کے درمیان ہوا ہے اس خیال کی غلطی ثابت کی ہے، ابلیس کہتا ہے ؎

اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر آہ وہ زندانی نزدیک و دور و دیر و زود

حرف استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

اس کے بعد خدا نے فرشتوں کی طرف مخاطب ہو کر اس خیال کی غلطی ثابت کی ؎

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

غرض اس قسم کے اور بھی بہت سے مسائل ہیں جن پر ڈاکٹر اقبال نے شاعرانہ انداز میں بحث کی ہے اور اگر اُن سب کو جمع کیا جائے تو ایک نیا علم کلام مرتب ہو سکتا ہے، بالخصوص رموزِ بے خودی میں انہوں نے خاص طور پر اسی قسم کے مسائل کی تشریح کی ہے مثلاً سب سے پہلے اُنھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ جب تک تمام افراد باہم منضم و مدغم ہو کر ایک متحدہ قومیت کی شکل نہ اختیار کر لیں اُس وقت تک فرد و قوم دونوں کا نظام ابتر رہے گا ؎

فرد می گیرد ز ملت احترام　　ملت از افراد مے یابد نظام

فرد تا اندر جماعت گم شود　　قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

لفظ چوں از بیت خود بیروں نشست　　گوہر مضموں بجیب خود شکست

برگ سبزے کز نہال خویش ریخت　　از بہاراں تار امیدش گسیخت

اور پیغمبروں کا کام اسی رشتۂ اتحاد کا مستحکم کرنا ہے، اگرچہ قدرتی اور تمدنی ضروریات کی بنا پر ایک نامکمل قومیت کا وجود ہمیشہ سے رہا ہے، تاہم جب تک کسی پیغمبر نے قومیت کے اس نظام کو مستحکم نہیں کیا اُس وقت تک قومیت کے اصلی جوہر ظاہر نہیں ہوئے، اس قسم کی قومیت کو ایک قافلے سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کے افراد میں باہم اتحاد تو ہو جاتا ہے، لیکن اس اتحاد کو مکمل نہیں کہہ سکتے ؎

خیمہ گاہ کاروان کوہ و جبل　　مرغزار و دامن صحرا و تل

سست و بیجاں تار و پود کار او　　ناکشودہ غنچۂ پندار او

نو دمیدہ سبزۂ خاکش ہنوز　　سرد خون اندر رگ تاکش ہنوز

پیغمبروں کی بعثت سے پہلے فرد و قوم میں اسی قسم کا ناقص ارتباط ہوتا ہے، لیکن جب کوئی پیغمبر مبعوث ہو جاتا ہے تو اس ناقص ارتباط کو مکمل کر دیتا ہے اور یہیں سے قومی ترقی کا دور شروع ہوتا ہے ؎

ناخدا صاحبدلے پیدا کند　　کز نوائے نغمہ انشا کند

رشتہ اش کو بر فلک دارد سرے　　پارہائے زندگی را ہمگرے

گلستاں روشت و در پیدا کند　　تازہ انداز نظر پیدا کند

از تف او ملتے مثل سپند　　بر جہد شور افگن و ہنگامہ بند

یک شررے افگند اندر دلش | شعلۂ درگیر می گردد گلش

لیکن پیغمبر جس قومیّت کو پیدا کرتے ہیں اُس کے چند بنیادی اصُول ہوتے ہیں، جن میں سب سے مقدم چیز توحید ہے ؎

بندہا از پاک شاید بندہ را | از خداوندان رباید بندہ را
گویدش تو بندۂ دیگر نۂ | زیں بتانِ بے زباں کمتر نۂ
تا سوے یک مدعایش میکشد | حلقۂ آئین بپایش میکشد

کیونکہ اس توحید سے اور تمام تفرقے مِٹ جاتے ہیں، اور قومیت کا پرکار صرف ایک نقطے پر گردش کرنے لگتا ہے ؎

اسود از توحید احمر مے شود | خویشِ فاروق و ابوذر مے شود
دل مقامِ خویشی و بیگانگی است | شوق را مستی زہم پیمانگی است
ملت از یک رنگیٔ دلہاستے | روشن از یک جلوہ این سیناستے
با وطن وابستہ تقدیرِ امم | بر نسب بنیادِ تعمیرِ اُمم
اصل ملت در وطن دیدن کہ چہ | باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ

اسی قسم کے اور بھی بہت سے مباحث اس مختصر سی مثنوی میں موجود ہیں جن پر متعدد مضامین لکھے جا سکتے ہیں ۔



اقبالؒ کی تعلیم

از

ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن

ستّر اسّی برس ہوئے ہندوستان کی اسلامی فضا میں ایک آواز گونجی جس سے زمین اور آسمان بھر گئے۔ اُس آواز کا منبع علی گڑھ تھا۔ سر سیّد نے اس شورِ قیامت کے ساتھ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگایا کہ در و دیوار گونج اُٹھے اور ہندوستان کے عالمِ اسلام میں ایک ہیجانِ عظیم پیدا ہو گیا۔

مسلمانوں کے ماضی و حال کو دیکھ دیکھ کر سر سیّد کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہتے تھے اور اُن کے استقبال پر نظر کر کے سر سیّد کی زبان اور قلم تنبیہ اور تنفیہ، تدبر اور تدبیر کا تلاطم پیدا کر رہے تھے۔

پہلا شخص جس نے سر سیّد کا پیغام شعر کے سانچہ میں ڈھالا وہ حالی تھا۔ حالی نے مسلمانوں کے ماضی و حال کا ایسا نقشہ کھینچا اور ایسے دردِ دل کے ساتھ اس داستان کو بیان کیا کہ شعر کی تاریخ اس کی نظیر سے خالی ہے۔ دوست اور دُشمن سب نے گردن ڈال دی اور حالی اسلام کا سب سے بڑا قومی شاعر مان لیا گیا۔

لیکن سر سیّد کا پیغام ابھی اجمالی تھا ـــــ انہوں نے جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ قوم اس قابل ہو جائے کہ اپنی حالت کو سمجھے اور حالات کو سمجھے اور پھر یہ بھی سمجھے کہ اُس کا مستقبل کیا ہونا چاہئے۔ اِس

مستقبل کی تفصیل ابھی باقی تھی۔

وہ شخص جس نے اس اجمال کی تفصیل کی جس نے ماضی سے استقبال کی طرف نگاہ کو پھیرا۔ وہ **اقبال** ہے۔ اقبال نے اس جوش وخروش اور اس ولولہ اور اُمنگ کے ساتھ زبانِ شعروادب میں اِس مضمون کو ادا کیا کہ یہ اُس کا حِصّہ ہوگیا۔ حالی ہمارے حال کا شاعر تھا، اقبال ہمارے استقبال کا شاعر ہے۔

ہندوؤں، بدھوں اور عیسائیوں کی تعلیم یعنی نفیِ خودی مسلمانوں میں پھیل گئی تھی۔ تصوّف و اِنزوا نے اُن کے ہاتھ پیر شل کردیئے تھے۔ نفیٔ خودی کی بدولت وہ اپنی ہی انفرادی خودی میں سُکڑ کر رہ گئے تھے۔ اقبال نے بتایا کہ سرِّ حیات نفیِ خودی میں نہیں بلکہ خودی میں مضمر ہے۔ یہ کائنات خودی کا مظہر ہے۔ خودی پیدا کر۔ یہی خودی ہے جو ایک اعلیٰ تر خودی یعنی بےخودی میں لے جائیگی۔ اور تو انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت میں آجائے گا۔

یہ تمام مقامات اقبال نے خود طے کیئے۔ آغازِ شعر میں وہ نفیِ خودی اور وحدتِ وجود میں مبتلا تھا پھر اُس پر خودی اور وحدتِ وجوب کا بھید کُھلتا ہے۔ اور آخر وہ بےخودی پر منتہی ہوجاتا ہے۔

اقبال کی عظمت کا یہ ثبوت ہے کہ وہ جس جس مقام سے گزرتا ہے۔ ایک عالم کے عالم کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ جب وہ نفیِ خودی کا راگ گا رہا تھا۔ لوگ اُسے الاپ رہے تھے۔ جب اُس نے خودی کا ڈنکا بجایا ہر ساز سے یہی آواز آنے لگی۔ اب جب کہ اُس نے بیخودی یعنی للّٰہیت اور قوم پرستی کا آوازہ بلند کیا سب اُسی میں آواز ملا رہے ہیں۔ آج مسلمانوں کا تمدّن اور اُن کی سیاسیات بدرجۂ غایت اِقبال کے شرمندۂ احسان ہیں۔

مسلمان ایک گم کردہ راہ قافلہ کی طرح سیاسیات کے لق ودق بیابان میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ مگر اس فلسفۂ حیات اور اسلامیات کے مبصّر نے اُن کے لئے ایک مطمح پیدا کر دیا جس کے صائب ہونے کو لوگ نہایت سُرعت کے ساتھ مانتے جا رہے ہیں۔ وقت آرہا ہے اُس کا جھنڈا عنقریب بلند ہو جائیگا۔

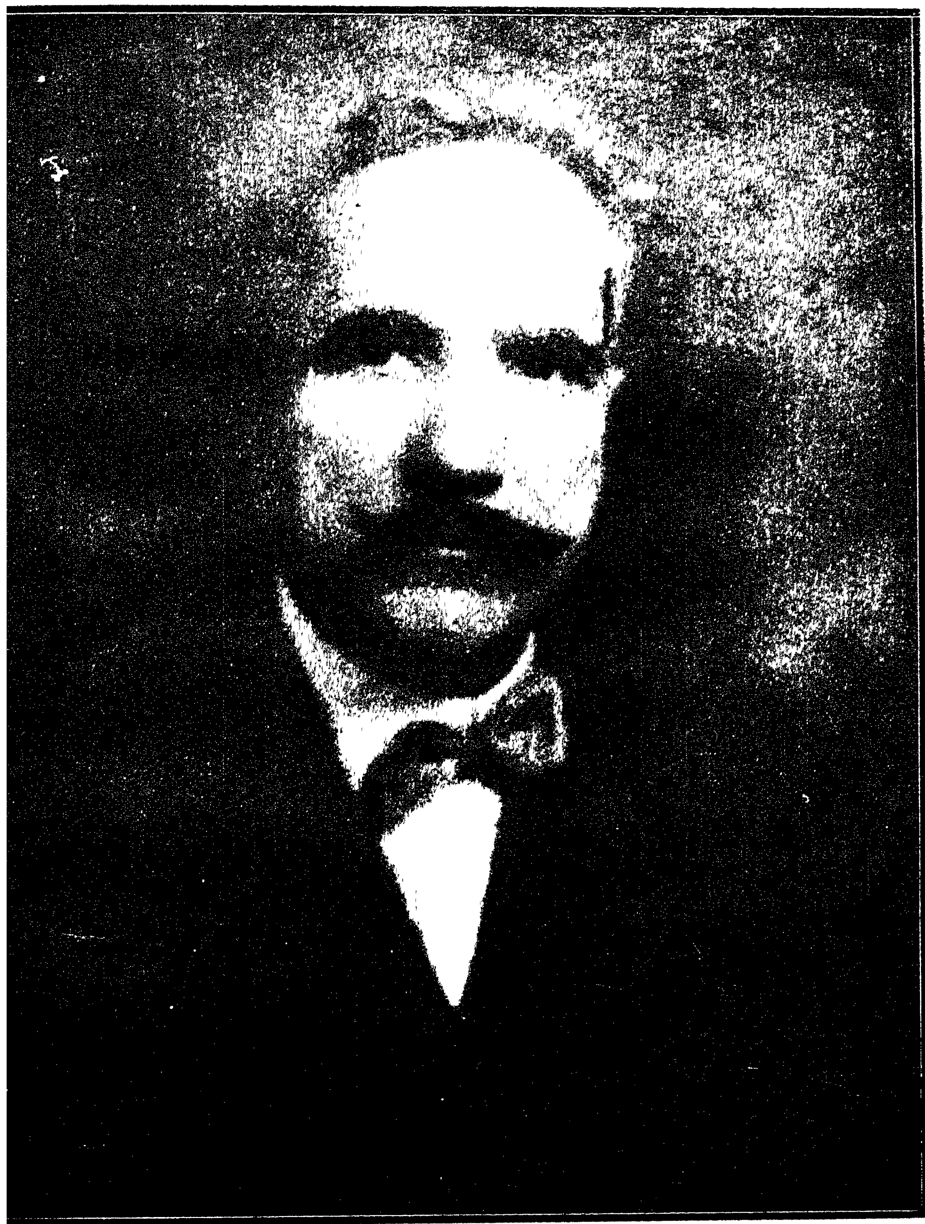
اقبال کہتا ہے کہ ع "من نوائے شاعرِ فرداستم"۔ لیکن یہ ایک صدائے بازگشت ہے اے اقبال! تیری صدا سے عالمِ اسلام کے دل و دماغ بھر گئے ہیں۔ وہ تیری ہی تعلیم کی طرف جا رہے ہیں۔ تو شاعرِ فردا ہی نہیں تو شاعرِ امروز بھی ہے۔ اور تیرا اثر اتنا بڑا ہے کہ شاید کسی اور شاعر کا کبھی ہوا ہو۔ تُو قومی شاعر ہی نہیں تو شاعرِ عہد (Poet of the age) ہے۔ یہ عہد تیرا عہد ہے، **عہدِ اقبال** ہے۔ کون شاعر تجھ سے پہلے یا تیرے زمانے میں۔ ہندوستان یا ایران وخراسان بلکہ امریکہ وفرنگستان میں ایسا ہؤا ہے جس کا تتبّع اس درجہ کیا گیا ہو جس کی آواز میں اس طرح آواز ملائی گئی ہو۔ آج جو شخص بھی شعر کہتا ہے وہ اقبال کے رنگ میں کہتا ہے، اقبال کی زبان میں کہتا ہے جو مضامین بھی وہ بیان کرتا ہے اقبال کے مضامین ہوتے ہیں۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بحریں بھی اقبال ہی کی ہوتی ہیں، اور شعر پڑھ کر سنانے کا طریقہ بھی اقبال ہی کا طریقۂ ترنم ہوتا ہے۔ ہاں، بایں وجود اس کے کہ ترنّم کی کم نوائی شوکتِ مضمون کی متحمّل نہیں!

زمانہ پر فرنگ چھا گیا تھا۔ اُس کا سیلِ بے پایاں ایسا چڑھا تھا کہ عالمِ اسلام بھی اس میں ڈوبا چلا جا رہا تھا۔ اے اقبال! تُو نے اپنی معنی خیز اور سوز انگیز آواز سے ایک سدِّ سکندری کھڑی کی اور اُسے بتا دیا کہ ؎

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن　　　قدم اُٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

اسلام اور ادبِ اسلامی ہمیشہ تیرا مرہونِ منّت رہے گا۔ اسلام کو حق ہے کہ تجھ پر فخر کرے اور ہندوستان کا فرض ہے کہ تجھ جیسے فرزند پر نازاں ہو۔ ہم دُعا کرتے ہیں کہ تیرا کلام ہمیشہ قوم کے دل کو گرماتا رہے اور اُسے عروج و اقبال کے آسمان تک پہنچائے تاکہ تیری دلی تمنا پوری ہو۔ اور تُو قوم کا اقبال بن کر دیر تک باقی اور صحت و سلامتی کے ساتھ اُس کا رہنما رہے!





علامہ سر محمد اقبال

اقبال حفیظ کی نظر میں

راہ گم ہے۔ میں مسافر ہوں، اندھیری رات ہے
کوئی سنگی ہے نہ ساتھی بس خدا کی ذات ہے

کارواں۔ غولانِ صحرائی کو رہبر مان کر
ہو چکا آوارہ۔ غربت ہی کو منزل جان کر

ہمرہوں کے اس چلن سے میرا دل چاک ہے
آہ اس اقدام کا انجام عبرتناک ہے

دیدہ ہائے غول کو سمجھے چراغاں کی بہار
توڑ کر عزمِ سفر کو چھٹ گئے پروانہ وار

جانتا ہوں اس روش کی پیروی بے سود ہے
اب مجھے تنہا تلاشِ منزلِ مقصود ہے

پیچھے پیچھے شور و شیون کی صدا سنتا ہوا
آگے آگے جا رہا ہوں اپنا سر دھنتا ہوا

وادیٔ غربت میں ہوں کوئی نہیں ہے رہنما
میری آنکھوں کا سہارا ہے ستاروں کی ضیا

خاص کر اک نجمِ رخشندہ مراد ساز ہے
دوسرے تاروں سے جس کی روشنی ممتاز ہے

اس کا سیلابِ ضیا ہے یا رواں ہے زندہ رود
میری فطرت سن رہی ہے اس کا نورانی سرود

اس کا دامانِ ضیا تو دسترس سے دور ہے
اس کے ذرّے سے گرمیٔ نظر معمور ہے

اب یہی تابندگی پنہاں مرے سینے میں ہے
اب اسی کا عکس میرے دل کے آئینے میں ہے

ناظرِ جلوہ ہے وہ میں طالبِ نظّارہ ہوں   عرش پر اس کی نظر میں فرش پر آوارہ ہوں
تاہم اِک نسبت تو اس اختر کو میرے دل سی ہے   واسطہ دونوں کا شاید ایک ہی منزل سی ہے
ہے ازل کی اس غلط بخشی پہ حیرانی مجھے   عشق لافانی ملا ہے۔ زندگی فانی مجھے
جس طرف جاتا ہے وہ اس سمت راہی میں بھی ہوں   طالبِ نظّارہ ہائے صبحگاہی میں بھی ہوں

یہ رہِ تاریک یہ محدود بینائی مِری   یہ سفر، یہ رات کا عالم، یہ تنہائی مِری
آسماں پر آگئی ہیں کالی کالی بدلیاں   چھا گئی ہیں بجلیاں چمکانے والی بدلیاں
بدلیوں سے بڑھتا جاتا ہے اندھیرا اور بھی   ہوتا جاتا ہے گھنا جنگل گھنیرا اور بھی
بجلیاں میری دلیلِ راہ بن سکتی نہیں   خیرہ کر سکتی ہیں، نورِ ماہ بن سکتی نہیں
ہوگئی ہے اب فضا کچھ اور بھی تاریک و تار   سنگ قدموں سے الجھنے لگ گئے دامن سے خار
سُن رہا ہوں بھیڑیوں کی غُرفشیں غرّاہٹیں   آرہی ہیں کان میں چیتوں کی خونی آہٹیں
چار سو غولوں کی آنکھیں آگ بھڑکاتی ہوئی   ٹولیاں بھوتوں کی، نغمے موت کے گاتی ہوئی
اور دیوانی ہوا بھی چیختی چنگھاڑتی   ناچتی ہے، خاک اُڑاتی، اور دامن جھاڑتی
پُرخطر ماحول ہے، لیکن چلا جاتا ہوں میں   وادیٔ پُرہول ہے، لیکن چلا جاتا ہوں میں

اور تو سارے ستارے بدلیوں نے چھا لیئے
پارہ ہائے نورِ ضو کی ظلمتوں نے کھا لیئے

اِک فقط میرا ستارہ ہے اُفق پر خندہ ریز
اور اس چھائی ہوئی ظلمت سے ہے گرمِ ستیز

بادلوں کی تیز پا موجوں سے ٹکراتا ہُوا
چل رہا ہے مُسکراتا، نُور برساتا ہُوا

ہر قدم پیغام ملتا ہے ستارے سے مجھے
کر رہا ہے مائلِ منزل اشارے سے مجھے

کہہ رہا ہے غم نہ کھا بے شک فضا تاریک ہے
منزلِ مقصود یعنی صبح بھی نزدیک ہے

تُو اگر گرمِ سفر ہے راستہ کٹ جائے گا
آسماں سے ابرِ ظلمت بار بھی چھٹ جائے گا

اے مرے پیارے ستارے اے مرے سچّے رفیق
ذرّۂ خاکی ہوں مَیں لیکن ہُوں تیرا ہم طریق

دیکھ! میری آنکھ سے اوجھل نہ ہو جانا کہیں
بدلیوں کی اوٹ میں ہو کر نہ کھو جانا کہیں

تُو اگر چاہے تو حاضر سینہ ہے تیرے لیئے
یہ مری آنکھیں نہیں ہیں آئینہ ہے تیرے لیئے

میرے دل میں بیٹھ مجھ کو سوئے منزل لیکے چل
ناخدا تُو ہے یہ کشتی تا بہ ساحل لے کے چل

تیرا اور میں زندگی میں شریکِ حال ہے
اے میرے روشن ستارے تو میرا اقبال ہے

پیامِ اقبال اور قرآن کریم

از

چوہدری غلام احمد پرویز بی۔ اے

باوجودیکہ قرآن کریم میں باعتبارِ بلاغت ہر وہ حُسن موجود ہے جو ایک بہترین شعر میں ہونا چاہیئے۔ بار بار اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن کریم شعر نہیں، رسول اکرمؐ شاعر نہیں +

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ۔ لِّیُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَیًّا وَّ یَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ۔ ۳۶ / ۷ - ۶۹

اور ہم نے اس رسول کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی یہ اس کے شایان شان تھی۔ یہ تو ایک فطرت کے بھلائے ہوئے سبق کی یاددہانی ہے اور کھلا کھلا قرآن (اور اس کا کام یہ ہے کہ) ہر اس شخص کو جس (کے تخن) میں زندگی کی تڑپ موجود ہے (فطرت کے اٹل قوانین سے) آگاہ کرے اور نہ ماننے والوں پر (ان کی ہلاکت اور بربادی سے پیشتر) اتمام حجت ہو جائے +

اس سے پتہ چل گیا کہ قرآن کریم کی رو سے محض "شاعری" کیوں کسی پیغمبر کے شایانِ شان نہ تھی۔ اور ایک رسول کا پیغام شعر کی تمام لطافتیں اور رنگینیاں اپنے اندر رکھتے ہوئے کس طرح "شعر" سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ پیغام جس کا سرچشمہ خدائے حیؔ و قیومؔ کا علم ازلی ہوتا ہے اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ

ہوتی ہے کہ وہ قوموں کے عروقِ مُردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیتا ہے۔ مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک دیتا ہے۔ یہی خصوصیت ہے جس کے لئے لوگوں کو قرآن کریم کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۸/۲۴	اے ماننے والو! اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہا کرو جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلاتا ہے جو تمہیں زندگی بخشتی ہے ؎

شعر اور قرآن کے اسی نمایاں فرق کو ایک دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے۔ کہ عام شاعروں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ:۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۔ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ۔ ۲۶/۲۲۵-۲۲۸	وہ یونہی ادھر سے ادھر صحرا نوردیاں اور دشت پیمائیاں کرتے پھرتے ہیں اور ان کے قول و فعل میں۔ قلب و زبان میں کبھی ہم آہنگی نہیں ہوتی ؎

ظاہر ہے کہ جس شخص کے سامنے کوئی منزلِ مقصود ہوگی۔ زندگی کا کوئی منتہیٰ ہوگا۔ اس کا ہر ایک قدم ایک خاص سمت میں اُٹھے گا۔ اس کا رُخ ایک خاص قبلۂ مقصود کی طرف ہوگا۔ برعکس اس کے جس شخص کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہ ہوگا۔ کوئی منزلِ مقصود متعین نہ ہوگی۔ وہ شُتر بے مہار کی طرح جدھر منہ اُٹھائے گا چل دے گا۔ کبھی تخیلات کی اس حسین و جمیل وادی میں۔ کبھی تصوّرات کے اس ہولناک اور بھیانک صحرا میں۔ مقصد پیشِ نظر محض گرمیٔ سخن ہوگا۔ اور اس کی خاطر اکثر و بیشتر یہی کرنا پڑے گا کہ دل کچھ محسوس کرے اور زبان کچھ کہے۔ برعکس اس کے۔ ایک شخص کے سامنے زندگی کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ مقصد بھی اپنا متعین کردہ نہیں۔ بلکہ وہ مقصد ہے جو قرآن کریم کا متعین فرمودہ ہے۔ کہ جس پر اس کا ایمان ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے قلب و دماغ۔ اپنے جذبات و افکار کو اس شے کے تابع رکھے۔

جس پر اس کا ایمان ہے - وہ سوچے تو اس کی مدد سے - وہ سمجھے تو اس کی روشنی میں - وہ دیکھے تو اسی نور سے - وہ حقایق کو پرکھے تو اسی کسوٹی پر - اور قبول کرے تو اس کو جو اس کی رو سے قبول کئے جانے کے قابل ہو - اور رد کرے تو اسی کو جو اس کے نزدیک مردود ہو - اب اگر ایسا مردِ مومن اپنے خیالات کو - جو دراصل قرآن کریم ہی کے خیالات ہونگے - زبانِ شعر سے ادا کرے - تو یہ شعراء کے اس زمرے میں آجائے گا جس کی استثنا قرآن کریم نے اس آیت میں فرما دی جو آیت مذکورۂ صدر سے متصل ہے:-

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ - وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا - وَانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۲۶/۲۲۷	مگر وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں - اعمال صالحہ کرتے ہیں اور اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں - اور اپنے آپ کی مدافعت اس وقت کرتے ہیں جب ان پر زیادتی کی جائے[1] ؛

اقبال اسی زمرہ میں شامل ہے اور شعر اور قرآن فہمی کی جن بلندیوں پر وہ پہنچ چکا ہے - ان کی رو سے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ عالمِ اسلامی نے آج تک ایسا شاعر نہیں پیدا کیا - لہٰذا اگر یہ درست ہے کہ کسی شاعر کے کلام میں عروسِ معنی کو بے نقاب دیکھنے کے لئے یہ ضروری ہے - کہ پہلے اِن جذبات اور احساسات کی تہ تک پہنچا جائے جن پر اس کی شاعری کی اساس ہے تو بلا تکلف کہا جا سکتا ہے - کہ اقبال کا کلام کماحقہٗ سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک قرآن کریم نگاہوں کے سامنے نہ ہو - جو اِس زاویۂ نگاہ سے پیامِ اقبال کو دیکھے گا - وہ جہاں ایک طرف یہ محسوس کرے گا کہ قرآن کریم انسان کو کن بلندیوں تک اُڑا کے لے جاتا ہے - دوسری طرف اس پر یہ حقیقت بھی منکشف ہو جائے گی کہ حضرت علامہ قرآن کریم کے بڑے بڑے اہم حقایق اور ادق مسائل کو کس خوبصورتی اور سلاست سے ایک ایک شعر میں

[1] یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایک مسلمان اپنی روش بدلنے پر کن حالات کے ماتحت مجبور ہو جاتا ہے ؛

حل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوگا کہ وہ کونسی شاعری ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس کا اتباع راہ گم کردہ لوگ کرتے ہیں (وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ ۲۶/۲۲۴) اور وہ کونسی جو اس منزلِ مقصود کے لئے چراغِ راہ کا کام دیتی ہے۔ جس کی طرف صراطِ مستقیم لے جاتا ہے۔ ایسا شاعر جس کے متعلق حضرتِ علامہ فرماتے ہیں :-

شاعر اندر سینۂ ملت چو دل ‌‌ ‌ ملتے بے شاعرے انبارِ گِل

سوز و مستی نقش بندِ عالمے است ‌ ‌ شاعری بے سوز و مستی ماتمے است

شعر را مقصود اگر آدم گری است ‌ ‌ شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

اس مختصر سے مقالہ میں اتنی گنجائش کہاں کہ میں حضرت علامہ کے تمام و کمال کلام کا تجزیہ قرآن کریم کی روشنی میں کرسکوں۔ فرصت ملی تو بعونہ تعالیٰ یہ بھی کبھی ہو سکے گا۔ اس جگہ صرف اس کے دو ایک گوشوں کو سامنے لانے کی کوشش کروں گا۔ اس سے میرے سامنے دو مقصد ہیں۔ ایک تو یہ کہ خود حضرتِ علامہ کے متعلق یہ معلوم ہو سکے کہ ان کا پیغام شاعری سے ماوراء ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ہماری قوم کے نوجوانوں کو۔ کہ جن کے سامنے ہم نے کبھی قرآن کریم کھول کر نہیں رکھا۔ یہ نظر آجائے کہ قرآن کوئی ایسی کتاب نہیں جسے ہم دورِ حاضرہ کی چمکتی ہوئی تہذیب۔ اور دمکتے ہوئے فلسفہ کے سامنے لانے سے شرمائیں۔ بلکہ یہ کہ انسان علم و عقل کی جن بلندیوں پر جا بے پہنچ جائے۔ قرآن کریم وہاں سے بھی دس قدم آگے نظر آئے گا۔ یہ ہے میرا مقصد۔

حکایتِ قدِ آں یارِ دلنواز کنم ‌ ‌ بایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

اگر کوئی شخص قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کو دو لفظوں میں بیان کرنا چاہے تو وہ نہایت اطمینان سے کہہ سکتا ہے۔ کہ قرآن جو پیغام نوعِ انسان کو دیتا ہے وہ ہے لَآ اِلٰہَ۔ اِلَّا اللّٰہُ اس کلمہ کے دو حصّے ہیں۔ ایک سلبی (Negative)۔ یعنی اس امر کا یقین۔ اس حقیقت کا اعتراف کہ دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے۔ جس کی غلامی اختیار کی جائے۔ جسے آقا تسلیم کیا جائے۔ جسے اپنی حاجات کا قبلۂ مقصود سمجھا جائے۔ یہ نفی کا پہلو ہے۔ تخریبی پہلو ہے یعنی جو کچھ پہلے ذہن میں موجود ہے اسے مٹا دینا ہوگا۔ بھلا دینا ہوگا۔ جب زمین یوں صاف ہو جائے۔ تو پھر اس پر ایک نئی عمارت تعمیر ہو گی۔ پھر ایجابی پہلو (Affirmative Side) آئے گا۔ تمام قوّتوں کے انکار کے بعد اس امر کا اقرار آئے گا کہ ہاں! مگر ایک قوّت ایسی ہے جس کی غلامی اختیار کرنا ضروری ہے۔ جس کے سامنے جھکنا زیبا ہے اور جسے اللّٰہ کہتے ہیں۔ تمام قوّتوں کو راستہ سے ہٹا کر یوں خدا اور بندے کا براہِ راست تعلق پیدا کر دینا۔ یہ ہے قرآن کریم کی تعلیم۔ دنیا میں اس تعلیم کو سب سے پہلے ایک منضبط شکل میں پیش کرنے والے حضرت خلیل اللّٰہ تھے۔ ان کی حیاتِ مقدّسہ کا یہ اہم واقعہ سب کو معلوم ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنی قوم کے صنمکدہ کے تمام بُتوں کو پہلے توڑا اور اس کے بعد خدائے واحد کی طرف دعوت دی۔ پہلا قدم لَآ اِلٰہَ تھا۔ اور اس کے بعد اِلَّا اللّٰہُ۔ جب تک مکان خالی نہ ہو۔ نیا مکین آکر نہیں بستا۔ اس حقیقت کے متعلق حضرتِ علّامہ فرماتے ہیں۔

صنمکدہ ہے جہاں۔ اور مردِ حق ہے خلیل ‏ ‏ ‏ یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لَآ اِلٰہَ میں ہے

اسی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی تفسیر سورۂ بقر میں یوں آئی ہے:۔

فَمَنۡ یَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَیُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ | جو شخص ہر سرکش قوّت کا انکار کر کے فقط ایک اللّٰہ پر ایمان رکھتا ہے

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا [۲۵۶/۲] | اس نے ایک ایسے مضبوط سرشتہ کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا

اسی کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ سے ایک شخص مسلم بنتا ہے۔

بیا کہ مثلِ خلیل این طلسم در شکنیم — کہ جز تو ہر چہ دریں دیر دیدہ ام صنم است

شرک کے متعلق بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی پتھر کی مورتی کے سامنے جھک جانے ہی کا نام ہے۔ اور بس۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے شرک یہی نہیں۔ بلکہ اللہ کے سوا اور کوئی طاقت ہو۔ اس کے سامنے جھک جانے کا نام شرک ہے۔ اور یہ تو نہیں وہ بت ہیں جن کی تعمیر کسی سنگ تراش کے ہاں نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ خود ذہنِ انسانی کے کارخانے میں ڈھلتے ہیں۔ ان کا مسکن کوئی مندر نہیں۔ بلکہ خود قلبِ انسانی ہوتا ہے۔ مال و اولاد کا بت۔ عزت و جاہ کا بت۔ دولت و ثروت کا بت۔ حکومت و سلطنت کا بت۔ ملک و نسب کا بت۔ اور نہ معلوم کون کون سے لات و منات اور کون کون سے ہبل و عزےٰ ہیں۔ جو ہر آن اس حجلۂ دماغ میں تراشتے رہتے ہیں۔ جن کے سامنے کھڑا یہ کانپتا ہے، لرزتا ہے۔ گڑگڑاتا ہے۔ سجدے کرتا ہے۔ ماتھے رگڑتا ہے۔ یہ ہیں وہ بت جن کے متعلق حضرت علامہ فرماتے ہیں :-

رہ مدہ در کعبہ اے پیرِ حرم اقبال را — ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

یہ بت انسان کی خواہشات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ اور یہ ہے شرک کی وہ خوفناک اور بھیانک گھاٹی جہاں سے پھسل کر انسان سیدھا ہلاکت اور بربادیوں کے ہولناک جہنم میں جا گرتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی شرک کے متعلق فرمایا ہے :-

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ | کیا تو نے اس کو بھی دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو ہی اپنا معبود بنالیا

اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ ۔ ۴۵/۲۳	یہ ہے وہ جسے اللہ نے باوجود اس کے علم وعقل کے اسے سیدھے راستے سے ہٹا دیا۔

کہ علم کا تقاضا تھا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کرتا۔ لیکن جب جذبات عقل پر غالب آجائیں جب خواہشات دماغ پر قابو پالیں۔ تو پھر علم وعقل کبھی صحیح راستہ کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتے۔ یہی وہ بت ہیں جن کی وجہ سے انسان قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر ۔۔۔ رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

ایک زنجیر سے اس کا پاؤں نکالا جاتا ہے تو یہ دوسری میں الجھا لیتا ہے۔ ایک کی غلامی کا طوق اس کے گلے سے اتارا جاتا ہے تو دوسرے کی غلامی کا طوق پہن لیتا ہے۔ حالانکہ جس رسول اکرم کی امت ہونے کا یہ مدعی ہے ان کی بعثت کا مقصد ہی ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :۔

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۷/۱۵۷	وہ انسانوں کے طوق وسلاسل اتارنے کے لئے بھیجا گیا ہے ان کے بوجھ ہلکے کرنے کو۔ اور ان کے پاؤں سے زنجیریں اتروانے کیلئے

لیکن اس کی کیفیت یہ ہے کہ :۔

فکر انساں بت پرستے بت گرے ۔۔۔ ہر زماں در جستجوئے پیکرے

باز طرح آذری انداخت است ۔۔۔ تازہ تر پروردگارے ساخت است

لہ تنہا عقل کیا کام کرتی ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر جوڈ جس کا شمار ماہرین علم النفس میں ہوتا ہے اپنی کتاب "Guide to modern thoughts" میں لکھتا ہے :۔

"عقل تو انسانی جذبات کی لونڈی ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ ہماری خواہشات کے حصول کے لئے ذرائع بہم پہنچائے۔ اور جو کچھ ہم جذبات کے ماتحت کرنا چاہیں اسکے جواز میں دلائل فراہم کر دے"۔

کاید از خوں ریختن اندر طرب ‏ ‏ ‏ ‏ نامِ او رنگ است و ہم ملک و نسب

بر سرِ ایں باطل حق پیرہن ‏ ‏ ‏ ‏ تیغ لاموجود الّا ھُو بزن

پھر جب تک دماغ سے ان غیر خدائی قوتوں کو نکالا نہ جائے۔ خدا کی حقیقت ذہن میں نہیں آسکتی۔ جب تک لوحِ قلب صاف نہ ہو توحید کے نئے حروف و نقوش اس پر لکھے نہیں جاسکتے فرماتے ہیں :-

بیاں میں نکتۂ توحید آتو سکتا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ترے دماغ میں بُتخانہ ہو تو کیا کہئے

یہی منفی اور مثبت کے دو ٹکڑے ہیں۔ جن کے جوڑنے سے کلمۂ توحید بن سکتا ہے جب تک آپ دوسرے آقاؤں کو جواب نہیں دیتے۔ کبھی نئے آقا کی غلامی اختیار نہیں کر سکتے۔ جب تک اس پرانی دنیا کو ویران نہیں کیا جاتا۔ جہانِ نو کی تعمیر نہیں ہوسکتی۔ جب تک اس زنگ کو اتارا نہیں جاتا۔ تلوار پر نئی آب نہیں چڑھ سکتی۔ رموز میں ارشاد ہے :-

آتشے افروز از خاشاکِ خویش ‏ ‏ ‏ ‏ شعلۂ تعمیر کُن از خاکِ خویش

اس کو برنگِ ریختہ یوں بیان کیا گیا ہے :-

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو ‏ ‏ ‏ ‏ خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تُو

حق آنے سے باطل خود بخود فنا ہوجاتا ہے۔ اندھیرے کی فطرت ہی یہ ہے کہ جب چراغ آجائے۔ تو گھر چھوڑ جائے۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۔ ۱۷/۸۱	کہئے کہ حق آیا اور باطل غائب ہوگیا۔ باطل تو بنا ہی اس لئے ہے کہ فنا ہوجائے ۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ اس فروغ حق کے لئے کرنا کیا چاہیئے - فرمایا -

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ　　پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار　　اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

زندگی کی قوّتِ پنہاں کو کر دے آشکار　　تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

حضرت علاّمہ کے کلام میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے - کہ ان کے الفاظ کے انتخاب میں جہاں "حسن شعریت" ملحوظ ہوتا ہے - وہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہتی ہے کہ ان الفاظ کا استعمال محض برائے "بیت گفتن" نہ ہو - بلکہ غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے - کہ ان کے الفاظ بھی قرآن کریم کے مختلف حقایق کے آئینہ دار ہوتے ہیں - اگر میں اس لحاظ سے ان کے اشعار اور اشعار کے الفاظ کی تشریح کرنے لگوں تو ظاہر ہے کہ ؎ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے ، ہر چند جی چاہتا ہے کہ ایسا بھی ہو - تاکہ ان کے کلام کی عظمت پورے طور پر سامنے آجائے - لیکن عدمِ گنجایش مانع ہے - مثال کے طور پر - مذکورۂ صدر اشعار کے پہلے شعر میں" صداقت کے لئے مرنے کی تڑپ" کا ذکر ہے - بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ شوکتِ الفاظ شعر میں حرارت پیدا کرنے کے لئے ہے - لیکن حقیقت اس سے کہیں بلند ہے - نبی اکرمؐ کے سامنے یہود وغیرہ بہت سی حجتیں پیش کرتے - بحث و جدل کا تقاضا کرتے لیکن قرآن کریم نے سچے اور جھوٹے کی پہچان کے لئے ایک اور ہی معیار پیش کر دیا - اور چیلنج دے دیا کہ آؤ اس کسوٹی پر پورے اُترو - فرمایا : -

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ　۲/۹۴

اگر تم سچے ہو تو ذرا موت کی تمنّا کر کے دکھاؤ - مرنے کی تڑپ پیدا کرو - یہ ہے صداقت کی پہچان ۔

دیکھئے۔ حضرت علامہ اس حقیقت کو ایک مصرع میں کس خوبصورتی سے بیان کر گئے ہیں۔ دوسرے مصرع میں "پیکر خاکی" میں جان پیدا کرنے کے الفاظ آتے ہیں۔ لیکن ان کی تشریح کے لئے مجھے قرآن کریم کی روشنی میں پورے نظریۂ ارتقاء (Theory of Evolution) کو بیان کرنا ہوگا۔ اس لئے اس مقام پر اس کی تفصیل سے اجتناب کرتا ہوں۔

ہاں! تو ہم کہہ یہ رہے تھے کہ لاؔ کی تخریب کے بعد اِلّاؔ کی تعمیر کی جائے۔ جب آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ ایک قدم آگے بڑھے ہیں۔ دورِ حاضرہ۔ جو یکسر اضطراب اور عدمِ اطمینان کا دور ہے۔ اپنی ہر روش میں لاہی لا کا اصول اختیار کئے جا رہا ہے۔ اور اس تخریب کو جہادِ زندگی سمجھ رہا ہے۔ حالانکہ یہ محض استہلاک (Destruction) ہے۔ تعمیر (Construction) نہیں۔ مذہبی معتقدات۔ اخلاقی اصول۔ سوسائٹی کی مسلّمہ روایات۔ سب اسی سیلاب لاؔ کی نذر ہو چکے ہیں۔ اور اس کے بعد اِلّاؔ کی تعمیر کہیں شروع نہیں ہوتی۔ حالانکہ تخریب سے غرض ہی ایک نئی تعمیر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

فضائے نور میں کرتا نہ شاخ و برگ و بر پیدا سفر خاکی شبستاں سے نہ کر سکتا اگر دانہ
نہادِ زندگی میں ابتدا لاؔ۔ انتہا اِلّاؔ پیامِ موت ہے جب لاؔ ہوا اِلّاؔ سے بیگانہ

عصر حاضر کے متعلق ارشاد ہے:۔

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مئے لاؔ سے مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلّاؔ

روس اس لاؔ کے جنون میں سب سے زیادہ شدت سے گرفتار ہے۔ اشتراکیت کی بنیاد ہی نفی سے شروع ہوتی ہے۔ خدا کی نفی۔ کلیسا کی نفی۔ املاک کی نفی۔ ملوکیت کی نفی۔ حکومت کی نفی (یعنی کمیونزم کے انتہائی دور میں) مسائلِ زندگی کی نفی۔ تدبیرِ منازل کی نفی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض چیزوں کی نفی نفی بھی

ضروری۔ لیکن محض نفی سے توکام نہیں چل سکتا۔ نفی کے بعد اثبات کی بھی توضرورت تھی۔ توہمات کو چھوڑئیے توحقایق پرتو ایمان لائیے۔ اس تفریط (Extremisticism) اسی کیسر کفر (انکار) ہی کا تونتیجہ ہے۔ کہ دنیا بھر میں انقلاب پیدا کر دینے کے مدعی خود اپنے اصولوں میں اس قدر عجلت سے انقلاب پیدا کئے چلے جا رہے ہیں کہ باریک بین نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ پھر وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے۔ روس کے متعلق ارشاد ہے :-

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ — لا سلاطیں۔ لا کلیسا۔ لا الٰہ
فکرِ او در تندبادِ لا بماند — مرکبِ خود را سوئے الّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں — خویش را زیں تندباد آرد بروں
در مقامِ لا نیاساید حیات — سوئے الّا می خرامد کائنات
لا و الّا سازو برگِ امتاں — نفیِ بے اثبات مرگِ امتاں

دو ہی صفحے پہلے ہے :-

نکتہ می گویم از مردانِ حال — امتاں را لا جلال۔ الّا جمال
لا و الّا احتسابِ کائنات — لا و الّا فتحِ بابِ کائنات
ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون — حرکت از لا زاید از الّا سکون

اس آخری مصرع کو غور سے دیکھئیے۔ جب تک قومیں لا کے بحران میں رہتی ہیں عدم سکون و فقدان طمانیت کے گرداب میں چکر کھاتی ہیں۔ کسی محکم چٹان پر ان کا قدم نہیں جمتا۔ آج ایک نظریہ قائم ہوتا ہے دنیا میں شور مچ جاتا ہے کہ بس وہ مداوا ہاتھ آ گیا جس سے تمام دنیا کے دکھ درد دور ہو جائیں گے۔ ابھی

چار قدم بھی اس کی روشنی میں نہیں چلنے پاتے کہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جسے تریاق سمجھ رہے تھے وہ زہر ہے۔ جسے چشمۂ حیواں تصوّر کئے بیٹھے تھے وہ سراب ہے۔ اُسے ڈھا دیا جاتا ہے اور پہلے کی طرح ایک اور فریب تیار کر لیا جاتا ہے۔ دو چار قدم اس کی روشنی میں چلتے ہیں۔ پھر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگ جاتے ہیں کُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمۡ مَّشَوۡا فِيۡهِ ۔ وَاِذَآ اَظۡلَمَ عَلَيۡهِمۡ قَامُوۡا (۲/۲۰) جب ذرا بجلی کی چمک پڑتی ہے تو اس میں دو قدم چل لیتے ہیں۔ اور جب وہ روشنی غائب ہو جاتی ہے تو پھر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف تکنے لگ جاتے ہیں۔ یہ ہے متذبذب زندگی کا وہ جہنم جس میں آج ساری دنیا گرفتار ہے۔ اور نتیجہ ہے اس اِلّا کے نہ ہونے کا۔ اس عملی شرک کا۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ ۔ فَتَخۡطَفُهُ الطَّيۡرُ اَوۡ تَهۡوِىۡ بِهِ الرِّيۡحُ فِىۡ مَكَانٍ سَحِيۡقٍ ۔ (۲۲/۳۱)

جو اللہ سے شرک کرتا ہے اس کی حالت یوں سمجھئے کہ گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرا۔ یا جیسے (مرغی کے چوزے کو) کوئی (عقابی پنجوں والا) پرندہ اچک کرلے جائے۔ یا جیسے تُند و تیز ہوا کے جھونکے (پر کاہ کی طرح) اسے کسی دُور دراز مقام پر پھینک دیں ؏

گویا اس نظام کا مرکزِ ثقل گم ہو جاتا ہے جس میں لَا ہی لَا ہو۔ اِلّا نہ ہو۔ وہاں حرکت ہی حرکت ہوتی ہے۔ سکون نہیں ہوتا۔ کہیں جم کر کھڑے ہونے کی مہلت نہیں ملتی۔ اسی لئے فرماتے ہیں کہ۔

بخود خزیدہ و محکم چوں کوہساراں زی ‏ ‏ ‏ مزی چوں خس کہ ہوا تند و شعلہ بیباک است

اس تعمیر کا سبق وہ ملتِ اسلامیہ کے ان نوجوانوں کو دیتے ہیں۔ جو لاعلمی کی وجہ سے اس قسم کی نفی کی طغیانیوں میں بہے چلے جا رہے ہیں۔

کہنہ را در شکن و باز بہ تعمیر خرام — ہر کہ در ورطۂ لا ماند۔ بہ اِلّا نرسید

اور ان مسلمانوں کو جو۔ ہزار ہزار تسبیح پڑھنے کے باوجود۔ لا الٰہ۔ اِلّا اللّٰہ۔ کے معنی نہیں سمجھتے۔ پھر سے یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں کہ ؎

کافرا! دلِ آوارہ دگر بارہ باو بند — بر خویش کشا دیدہ و از غیر فرو بند

دیدن دگر آموز ندیدن دگر آموز

پھر سے سیکھ کہ لا کہاں کہاں استعمال ہوگا اور اِلّا کہاں سے شروع ہوگا ؛

جب تک انسان لا کے بھنور میں رہتا ہے۔ وہم و قیاس آرائیوں کا تختۂ مشق بنا رہتا ہے۔ اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس تذبذب اور گمان میں قلبِ انسان کس جہنم میں رہتا ہے۔ اطمینان و سکون یقین میں ہے۔ اور یقین پیدا نہیں ہوسکتا جب تک اس سلبی لا کے بعد ایجابی اِلّا نہ آجائے۔ اس کیفیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو زباں تُو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے

مومن خدائے لم یزل کا دستِ قدرت کیسے بنتا ہے! اس کی تفسیر دیکھنی ہو تو قرآن کریم میں واقعۂ بدر دیکھئے۔ کہتے ہیں کہ واٹرلو کی لڑائی نے یورپ کی تاریخ بدل دی۔ لیکن جن کی نگاہیں دُور رس اور دقیقہ شناس واقع ہوئی ہیں ان کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہے۔ کہ بدر کی لڑائی نے دنیا کی تاریخ بدل ڈالی۔ اگر اس وقت۔ خدانکردہ۔ مسلمان مجاہدین کی وہ مٹھی بھر جماعت جو اونٹوں کی پسلیاں اور کھجوروں کی ٹہنیاں لے کر سربکف میدان میں آگئی تھی۔ کہیں ضائع ہوجاتی۔ تو آج دنیا پر توہم پرستی کے گھناؤنے بادل منڈلا رہے ہوتے اور کوئی نہ جانتا کہ علم و عقل۔ شعور و ادراک۔ حکمت و فلسفہ کیا شے ہے۔ اور کوئی

نہ پہچانتا کہ اس دنیا میں صحیح پوزیشن کیا ہے۔ آج نہ اقبال ہوتا نہ اقبال کے یہ قلب و دماغ میں چمک پیدا کر دینے والے حقایق اور روح میں برقِ تپاں بن کر دوڑ جانے والے شعر۔ ہاں! تو اس بدر کی لڑائی میں جبکہ تین سو بارہ۔ بظاہر بیکس و بےبس مسلمانوں کا مقابلہ قوت اور سامان کے ہجوم کے ساتھ تھا۔ مومنین کے دست و بازو خدا کے ہاتھ بنے۔ فرمایا کہ:-

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ ـ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ـ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ ـ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ـ ۸/۱۷

تم نے ان دشمنوں کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا ہے۔ تم نے تیر اندازی نہیں کی۔ بلکہ وہ تو اللہ نے کی ہے۔ تلواریں تمہاری تھیں اور ان میں بجلیاں ہمارے غضب کی کوند رہی تھیں۔ تیر تمہارے تھے اور ان کی انیوں کے ساتھ قضائیں ہماری لپٹ رہی تھیں۔

یہ تھے وہ دست و بازو جن کے متعلق فرمایا کہ ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا ۔۔۔ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

لیکن برعکس یقین کے جو شخص مغلوبِ گمان رہتا ہے۔ جو ایمان محکم کی بجائے تذبذب و وساوس میں اُلجھا رہتا ہے۔ اس کی تمام محنتیں اکارت جاتی ہیں۔ تمام کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ تمام ساز و سامان۔ تمام جیوش و عساکر۔ دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ بعینہٖ جس طرح کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گولی چلانے والا اپنا کارتوس بھی ضائع کر دیتا ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ـ ۵/۵ جس نے ایمان و یقین سے انکار کیا۔ تو اس کے تمام اعمال ضائع ہو گئے لیکن جب اس میں ایمان پیدا ہو جائے تو پھر انہی بازوؤں کی پرواز حدود فراموش اور انہی ہاتھوں کی قوتیں وسعت ناآشنا ہو جاتی ہیں۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا — تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

قرآن کریم میں انہی لوگوں کے متعلق ہے کہ :-

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللہ - ثُمَّ اسْتَقَامُوْا - تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ - اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا - وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ - ۴۱/۳۰

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے - اور پھر اس یقین پر جم کر کھڑے ہو گئے - تو ان پر خدا کے فرشتے نازل ہوتے ہیں - (جو انہیں بشارت دیتے ہیں کہ) مت ڈرو - بالکل نہ گھبراؤ تمہارے لئے خوشخبری ہے اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے ؎

جب انسان میں ایمان و یقین کی یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے - تو پھر اس کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے - وہ ہر شے کو ایک نئے انداز سے دیکھتا ہے - اس کی آنکھ پر کسی خارجی اثر کا رنگین چشمہ نہیں ہوتا - گویا وہ ہر چیز کو اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے - یہاں پہنچ کر حضرت علامہ فرماتے ہیں ؎

میانِ آب و گِل خلوت گزیدم — زافلاطون و فارابی بریدم

نکردم از کسے دریوزۂ چشم — جہاں را جز بہ چشمِ خود ندیدم

قرآن کریم نے علم کی جو تعریف کی ہے - وہ یہی ہے - کہ علم اپنے سمع - بصر - اور قلب کی شہادت سے حاصل ہوتا ہے -

لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ - اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ - کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا -

جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو - یاد رکھو سمع بصر اور قلب ہر ایک کی بابت پرسش ہوگی ؎

پوچھا جائے گا کہ جس چیز کو تم نے بطور علم کے تسلیم کیا تھا اسے تم نے سماعت و بصارت کی رُو سے - تجربات و مشاہدات کے ذریعہ سے پرکھ کر دیکھ لیا تھا کہ واقعی یقینی شے ہے - اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تمہارے

قلب سلیم کو بھی اپیل کرتا تھا۔ اس کے برعکس ان ذرائع سے کام نہ لینے والے کو قرآن کریم نے جہنمی قرار دیا ہے۔ وہ لوگ کہ جو

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا - وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا - وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا - اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ -	دل و دماغ رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے آنکھیں رکھتے ہیں۔ لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ تو بالکل ڈھور ڈنگر ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گذرے۔ ان سے بھی زیادہ بے راہ رو[1]

بیکن نے علم کے متعلق یہی نظریۂ استقرار پیش کیا اور یورپ کی کایا پلٹ دی۔ اور قرآن کریم نے چودہ سو برس پیشتر علم کی یہی تعریف بیان فرمائی۔ لیکن قرونِ اولےٰ کے بعد مسلمانوں نے اسے غلاف اوڑھا کر اونچے اونچے طاقوں میں نہایت ادب و تعظیم سے رکھ چھوڑا اور خود اندھوں کی طرح دوسروں کی لکڑی کے سہارے چلنے گئے۔ کہ وہ گڑھے میں گرے تو یہ بھی ساتھ ہی جائیں۔

ہاں! تو حضرت علامہ علم کی اسی قرآنی تعریف کے متعلق فرماتے ہیں کہ "جہاں اُجز بہ چشمِ خود ندیدم اسی چشمِ خود" کے متعلق ضربِ کلیم میں ہے۔

دیکھے تُو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں تیرے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے
ظاہر تیری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تیری موجِ گہر سے
شرمندہ ہو فطرت تیرے اعجازِ ہنر سے

[1] اسلام کو عقل و بصیرت کے خلاف کہنے والے زیادہ نہیں تو انہی دو ایک آیات پر غور فرمائیں اور دیکھیں کہ ایسا مذہب کبھی علم و بصیرت کے خلاف ہو سکتا ہے!

اغیار کے افکار و تخیّل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

یہ ہے جہاں کو اپنی نظر سے دیکھنا۔ یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ آپ کی دنیا میں کیسا تحیّر انگیز انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ نگہ کے بدل جانے سے ہر شے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ دنیا کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ اشیاء کی قیمتیں بدل جاتی ہیں۔ اور قرآن کریم کے الفاظ میں۔ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ یہ زمین بدل جاتی ہے۔ یہ آسمان بدل جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

بخود نگر انگہ ہائے جہاں چہ می گوئی   اگر نگاہِ تو دیگر شود جہاں دگر است

جاوید نامہ میں ہے۔

اینکہ منزل را نمی دانی زرہ   قیمت ہر شے ز اندازِ نگہ
نوع دیگر شو۔ جہاں دیگر شود   ایں زمین و آسماں دیگر شود

یہی وہ نگاہیں ہیں جن سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ اور یہی وہ نگاہیں ہیں جو بدبختی سے ہماری قوم کے نوجوانوں سے چھن چکی ہیں۔ جسے وہ بزعم خویش اپنی نگاہیں سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی نہیں ہوتیں۔ دوسروں کی مستعار ہوتی ہیں۔ یہی وہ متاع گراں بہا ہے جس کے چھن جانے پر ہر رونے والی آنکھ روتی ہے۔ اور ہر تڑپنے والا دل تڑپتا ہے۔ یہی نوجوانوں کی "بے بصری" اقبال کو بھی لہو رُلاتی ہے۔ اور اس نے اپنے قلب و دماغ کے بہترین جوہر اسی جہاد میں صرف کر ڈالے ہیں کہ کہیں سے یہ فردوسِ گم گشتہ پھر نوجوانوں کو مل جائے ؎

لیکن مومن کی "یہ چشم خویش"۔ یہ اپنی آنکھ۔ اس وقت اپنی بنتی ہے جب یہ قرآن کی روشنی

میں اس آنکھ سے کام لے۔ کہ جس طرح آنکھ۔ باہر کے نور۔ بیرونی روشنی کے بغیر بیکار ہے۔ دیدۂ عقل قرآن کریم کے نور مبین کے بغیر بالکل کور ہے۔ اسی کے متعلق نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ یہ خدا کا نور۔ قرآن کریم ہے۔ ایک مردِ مومن دنیا کی ہر شے کو قرآن کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اس کے افکار و آرا ء اس کے تابع چلتے ہیں۔ اس کا علم و فلسفہ اس کی پیروی کرتا ہے۔ یہ ہے فرق ایک مومن اور غیر مومن حکیم میں۔ غیر مومن یا تو تنہا اپنی عقل کے زور پر چلتا ہے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے یا دوسرے انسانوں کے پیچھے پیچھے۔ قدم بقدم چلتا ہے کہ اگر وہ جہنم کا راستہ اختیار کئے ہے تو یہ بھی وہیں پہنچے گا۔ برعکس اس کے ایک حکیم مومن اپنی عقل و خرد سے قرآن کریم کی روشنی میں کام لیتا ہے۔ اور چونکہ وہ روشنی خدائے علیم و خبیر کی عطا فرمودہ ہے۔ اس لئے وہ اشیاء کی حقیقتوں کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ اور انسان پھر کہیں لغزش نہیں کھاتا۔ یہ ہے وہ حصّۂ اِلّاَ جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ اور جس سے محروم رہنے کی وجہ سے آج دنیا جہنم زار بن رہی ہے۔ اور یہ حصّۂ اِلّاَ۔ یہ خدا کے غیر متبدل قوانین۔ یہ فطرت کے اٹل حقایق۔ سوائے قرآن کے دنیا میں آج اور کہیں نہیں ہیں۔ چونکہ حضرتِ علّامہ کو معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن کریم انسان کو کس قسم کی بصیرت عطا کرتا ہے۔ یہ نگاہوں کو کس اوج تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ قلب انسانی میں کیا کیا انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ یہ کس طرح اس کی ساری دنیا بدل دیتا ہے۔ اس لئے جہاں کہیں وہ قرآن کریم کا ذکر کرتے ہیں تو وجدِ مسرّت سے جھوم اٹھتے ہیں۔ ان کے ایک ایک لفظ سے قرآن کریم سے عشق و محبت کی چاشنی ٹپکتی ہے۔ وہ خود بھی اس میں جذب ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی جذب کر لیتے ہیں۔ نمونہ میں فرماتے ہیں

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اولایزال است و قدیم

نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

حرفِ او را ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رحمۃٌ للعالمیں

پھر اور سنئے

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

چوں مسلماناں اگر داری نظر
در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

بندۂ مومن ز آیاتِ خداست
ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست

چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش

دو چیزیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو "ضمیرِ خویش" اور دوسرے "عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست" اس عصرہا پیچیدہ کی خوبصورتی دیکھنے سے علاقہ رکھتی ہے۔ قرآن کریم کی آیات کو کھولتے جائیے۔ جہاں اندر جہاں۔ زمانہ در زمانہ۔ ان کے اندر لپٹا ہوا ملے گا۔ قرآن کتابِ فطرت ہے۔ یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانہ میں بھی جا کر یہ کہہ دے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح قرآن بھی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ بس اب میں تھک گیا۔ جو کچھ میرے اندر تھا سب باہر آچکا۔ اب میں خالی برتن ہوں۔ اب کسی اور رہبر کی تلاش کرو۔ قطعاً نہیں۔ فطرت کی کسی چیز کو لیجئے۔ مثلاً پانی۔ حضرت آدم کے وقت میں لوگ اتنا ہی جانتے ہوں گے کہ اس سے پیاس بجھائی جاتی ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس سے

نہا یا بھی جاتا ہے۔ لیکن اس پانی کے اندر چھپی ہوئی خصوصیتیں زمانہ کی عقل و علم ۔ تجربہ و مشاہدہ ۔ وسعت و بلندی کے ساتھ ساتھ یوں کھلتی گئیں جیسے وہ اس کی لہروں کے بیچ میں لپٹی ہوئی تھیں۔ آج دیکھئے اس پانی سے کس قدر کام لئے جا رہے ہیں۔ کیا حضرت آدم کے وقت کے پانی میں یہ خصائص موجود نہ تھے! یا کیا دنیا آج یہ کہہ سکتی ہے کہ پانی میں جو کچھ تھا سب معلوم کر لیا گیا ہے! دنیا اپنے تجربات کی جن بلندیوں تک چاہے اڑتی چلی جائے۔ فطرت کی اشیاء ان کا ساتھ دیتی جائیں گی۔ اسی فضا کو دیکھئے۔ جو کل تک خالی سمجھی جاتی تھی۔ آج اس میں ایتھر کی امواج نے کیا کچھ کر دکھایا ہے۔ کیا ایتھر پہلے موجود نہ تھا! کیوں نہ تھا۔ اسی خلا میں لپٹا ہوا تھا۔ پیچیدہ تھا۔ یہی قرآن کریم کی کیفیت ہے۔ زمانہ علم و عقل کی جن پہنائیوں تک چاہے بلند ہوتا چلا جائے۔ قرآن اس سے بھی آگے نظر آئے گا۔ جو بات آج سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اسے کل کی آنے والی نسلیں۔ جو اگر تجربات و مشاہدات میں موجودہ نسل سے آگے ہونگی خود بخود سمجھ جائیں گی۔ اسی طرح قرآن کی ایک ایک آیت حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آتی جائے گی۔ اس وقت اس کی کوئی آیت متشابہ نہ رہے گی۔ سب محکم ہو جائیں گی۔ یہ میں نہیں کہتا۔ خود قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۔ ۴۱/۵۳

ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں اس نظامِ کائنات میں اور خود نفسِ انسانی کے اندر دکھاتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن فی الواقعہ حق ہے ؛

باقی رہا "در ضمیرِ خویش"۔ خود نفسِ انسانی کے اندر کی نشانیاں ۔ سو اس کے متعلق دنیا ابھی بہت پیچھے ہے۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا کہ وی آنا کے مشہور ڈاکٹر فرائڈ نے علم تجزیۂ نفس (Psycho-Analysis)

کے متعلق مشاہدات سے علم النفس کی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اور اس کے رفقائے کار ایڈلر اور ژونگ نے اس پر مزید اضافوں سے نفس انسانی کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں بڑی آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ یہ نظریے ہنوز اپنے عہد طفولیت میں ہیں۔ ذرا پختگی کی حد تک پہنچ جائیں تو پھر دیکھئے کہ قرآن کریم نے نفس انسانی کے متعلق جو کچھ بیان کر رکھا ہے وہ کس طرح حرف حرف سمجھ میں آجاتا ہے۔ دُنیا کو ذرا آگے تو بڑھنے دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ قرآن اسے کہاں لے جاتا ہے۔ کہ عصر ہا پیچیدہ در آنات اوست ؛

---

(۲)

اس نظامِ کائنات میں انسان کی صحیح پوزیشن کیا ہے! اسے سب سے پہلے قرآن کریم نے ہی متعین کیا ہے۔ اسی کا نام حضرت علامہ کے الفاظ میں خودی ہے۔ یہ اعلان آپکو قرآن ہی میں ملے گا کہ

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۔	جو کچھ زمین اور آسمانوں کے اندر ہے۔ جو کچھ ان پستیوں و بلندیوں میں ہے۔ سب کچھ تمہارے تابع فرمان کر رکھا ہے ؛

یہ تو اسی کائنات سے متعلق ہے۔ لیکن قرآن کریم تو اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ (اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا)۔ حضرت علامہ انسان کی گذری ہوئی کہانیوں کی تحقیق میں زیادہ کاوش پسند نہیں فرماتے کہ وہ ایک نظری سی شے ہے۔ ہماری "آج" کی دنیا پر اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ اسلئے وہ فرماتے ہیں کہ

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے ۔۔۔ کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

قرآن کریم بھی کوئی علم الحیات (Biology) کی کتاب نہیں کہ اس میں ان امور کی ریسرچ دے رکھی ہو۔ بایں ہمہ جہاں کہیں ضمناً تخلیق انسانی کا ذکر اس میں آگیا ہے۔ جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ وہی ہے جس پر

انسان اپنے کمالِ تحقیق کے بعد پہنچے گا۔ یہی حالت دیگر علوم سائنس کے متعلق ہے۔ قرآن کریم میں تبعاً اور ضمناً جہاں جہاں ان کا ذکر آگیا ہے۔ وہ ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ انسانی انکشافات جس نتیجہ پر پہنچیں۔ قرآن اس کے خلاف ہو۔ بشرطیکہ وہ انکشاف حقیقت کی حد تک پہنچ چکا ہو محض قیاس آرائی ہی نہ ہو۔ انسانی انکشاف ہے کیا! یہی نا کہ فطرت کی ایک حقیقت پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ نظروں سے اوجھل تھی۔ انسانی کدو کاوش نے وہ پردہ اٹھادیا۔ وہ حقیقت جیسی تھی سامنے آگئی اسی کو انکشاف کہتے ہیں۔ ایتھر اس فضا میں موجود تھا۔ بجلی کی لہریں یہیں تڑپ رہی تھیں۔ اتنا ہی تھا کہ پہلے نگاہ سے اوجھل تھیں۔ اب بے نقاب ہو کر سامنے آگئیں۔ لیکن خدا وہ ہے جس نے اِن تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ اگر یہ چھپی ہوتی ہیں تو انسانوں کی نگاہوں سے چھپی ہوتی ہیں۔ خدا کی نگاہوں سے تو چھپی ہوئی نہیں ہوتیں۔ اس لئے جہاں کہیں خدا ان کا ذکر کرے گا۔ وہ تو ایسے ہی کرے گا جیسے کوئی اس چیز کی بابت کچھ کہے جو اس کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب موجود ہو پھر کس طرح ممکن ہے کہ انسانی انکشافات کے نتائج اور قرآن کریم کا بیان باہمی متضاد ہوں۔ جہاں کہیں تضاد ہو۔ سمجھ لیجئے کہ انسانی تحقیق میں ابھی غلطی ہے۔ جسے وہ حقیقت سمجھ رہا ہے۔ قیاس آرائی ہے۔ کہ جب حقیقت۔ حقیقت ہو کر سامنے آجائے گی تو وہ وہی ہو گی جو اس حقیقت کے پیدا کرنے والے نے اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہے۔ اس نظریۂ ارتقا کو لیجئے جو دورِ حاضرہ کے انکشافات میں ایک معرکۃ الآرا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نظریہ میں جو چیزیں بطور حقیقت کے معلوم ہو چکی ہیں وہ وہی ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ اور جن کی روشنی میں اسلامی مفکرین مثل فارابی اور ابن مسکویہ نے۔ ویلیس اور ڈاروِن سے کہیں پہلے۔ ان نظریوں کی داغ بیل ڈال

دی تھی[1]۔ (نظریۂ ارتقا اور قرآن کریم۔ ایک جداگانہ مبحث ہے جسے کہیں اور بیان کیا جائے گا)۔
لیکن یورپ کے حکماء اس نظریہ کے ماتحت انسان کی سابقہ کڑیوں کی تحقیقات کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں اور انسان کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتے ہیں۔ کہ اس کی موت کے ساتھ یہ سلسلۂ ارتقاء بھی منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس حصۂ زندگی کو محض ابتدا قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ منزل تو ابھی شروع ہوئی ہے۔ انسان کی موت اس سلسلۂ ارتقا کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک اگلی کڑی کی ابتدا ہے۔ آپ دیکھئے کہ سلسلہ ارتقا میں جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوانات تک آتے آتے ایک نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگلی منزل میں بمقابلہ پچھلی منزل کے ایک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جو مجرد مادہ میں موجود نہ تھی۔ مادہ غیر شعوری شے ہے۔ اس میں تعقل و ادراک نہیں۔ لیکن مٹی سے درخت اور درخت سے حیوان کی تدریجی ترقی میں یہ کیفیت نظر آئے گی کہ وہ چیز جو مادہ میں مفقود تھی۔ ان اگلی کڑیوں میں پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ حیوانات میں ایک خفیف سی حد تک عقل و شعور آجاتا ہے اور اس سے اگلی منزل۔ یعنی انسان میں یہ خصوصیت اُبھر کر سطح پر آجاتی ہے۔ شعور و ادراک۔ جذبات و احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے۔ جو مادہ میں موجود نہ تھی۔ گویا سلسلۂ ارتقا کی ہر کڑی میں "مادیت" سے کسی "غیر مادیت" کی طرف قدم اٹھتا ہے۔ "خاکی" سے کچھ "نوری" سا ہو جاتا ہے۔ ہر چند "غیر مادی"

---

[1] اسی طرح مثلاً فلکیات کو لیجئے۔ جو کچھ گیلیلو اور کوپرنیکس نے اپنی آنکھوں سے (بذریعہ دوربین) دیکھ کر کہا اور جس پر آج کے نظریۂ فلکیات کا مدار ہے۔ قرآن کریم نے چودہ سو برس پیشتر وہی کچھ کہہ دیا تھا۔ یا اس تخلیق ارض و سما کے متعلق جو کچھ سائنس کے انکشافات ثابت کر رہے ہیں۔ ایک ایک چیز قرآن کریم میں موجود ہے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ قرآن کو تو مسلمان کھول کر دیکھتے ہی نہیں ؛

عنصر را سے ایسا ہی کہنا چاہیئے۔ کیونکہ اور کوئی لفظ اس مفہوم کو ٹھیک ادا نہیں کرسکتا، انسان میں آ کر نمایاں ہوگیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ یہ عنصر ابھی اپنے عہدِ طفولیت میں ہے۔ لہذا یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ سلسلہ یہیں ختم ہوجائے۔ اس کا آگے بڑھنا ضروری ہے۔ اور یہی آگے بڑھنے کی منزلیں ہیں جہاں جا کر یورپ کے حکماء اور ایک مسلم حکیم میں فرق شروع ہوتا ہے۔ حکیمِ مومن کے نزدیک حیات ایک مسلسل شے ہے۔ اور موت اس کا خاتمہ نہیں کردیتی۔ بلکہ شب تیرہ و تار کے بعد ایک نیا دن طلوع کرتی ہے۔ مادی عنصر میں تو تاریکی ہی تاریکی ہے۔ یہ عقل و خرد۔ یہ شعور و ادراک کی چمک تو مادہ سے آگے بڑھنے میں ہی پیدا ہوتی ہے۔ لہذا یہ سلسلۂ ارتقاء جتنا آگے بڑھتا جائے گا۔ تیرگی درخشندگی میں تبدیل ہوتی جائے گی۔ وہ لوگ جن کے اس منزل میں اعمال صالح ہوں گے۔ یعنی ایسے کام جو اس میں یہ صلاحیت پیدا کردیں۔ کہ وہ اس سے اگلی زندگی۔ اس سے نفیس و لطیف۔ اس سے اعلےٰ و ارفع زندگی۔ بسر کرسکے۔ وہ اوپر کی منزل میں چلے جائیں گے۔ جسے جنت کہتے ہیں جن کے اعمال انہیں اصلح (The fittest) نہیں بنائیں گے وہ سلسلۂ ارتقاء کی اگلی منزل میں نہیں پہنچ سکیں گے۔ وہیں روک دیئے جائیں گے۔ یہ جہنم کی زندگی ہوگی۔ لہذا موجودہ زندگی تو انسانی خمیر کے آب و گل کی زندگی ہے۔ ذرا اسے سنور لینے دیجیئے۔ پھر دیکھئے یہ کیا بنتا ہے۔

"انسان کا مستقبل"۔ یہ ہے وہ موضوع جو حضرت علامہ کے تمام کلام کا گویا نقطۂ ماسکہ ہے۔ فرماتے ہیں:-

یکے در معنیٔ آدم نگر از من چہ می پرسی ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے کہ یزداں را دل از تاثیر اُو پُرخوں شود روزے[1]

[1] میں ہمیشہ حضرت علامہ کے کلام کا کسی دوسرے شاعر کے کلام سے موازنہ لاحاصل سمجھا کرتا ہوں۔ اس لئے کہ (باقی برصفحہ ۴۸)

اس نظامِ کائنات میں انسان کا درجہ کس قدر بلند ہے۔ اس کے لئے اس داستانِ حقیقت کشا کو دیکھئے جو تخلیقِ آدم کے باب میں پہلے ہی پارہ میں تمثیلاً بیان کی گئی ہے۔ اور جس میں فطرتِ انسانی سے خطاب ہے۔ حضرت آدم گویا تمام نوعِ انسانی کے نمائندہ ہیں۔ فرشتوں سے کہا جاتا ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں کی معصوم نگاہیں جب اس ہیولیٰ آب و گل کو غور سے دیکھتی ہیں تو اس میں خون کے چھینٹے اور آگ کی چنگاریاں نظر پڑتی ہیں۔ عرض کرتے ہیں کہ بارِ الٰہ! یہ فتنہ سامانیوں کا مجموعہ اور خلیفہ فی الارض!! اس اعزاز کے مستحق تو کچھ ہم ہی نظر آتے ہیں۔ کہ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں۔ اور اپنے اختیار و ارادہ سے کام لئے بغیر وہی کچھ کرتے ہیں جس کا ہمیں حکم دیا جاتا ہے۔ خلاّقِ فطرت کے چہرے پر ایک حسین تبسّم نے گل فشانی کی اور فرمایا کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں جانتا ہوں۔ کہ یہ

موازنہ کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے۔ جہاں دو شاعر ایک ہی میدان کے شاہسوار ہوں۔ مثلاً انیس و دبیر یا ہمارے غزل گو شعراء۔ لیکن حضرت علاّمہ تو اپنے میدان میں مردِ وحید ہیں۔ موازنہ کس سے کیا جائے۔ لوگ ان کی "شاعری" کا دوسروں کی شاعری سے مقابلہ کیا کرتے ہیں۔ لیکن یہاں محض "شاعری" کا تو سوال ہی نہیں۔ یہ تو چیزے دیگر ہے۔ یہ بات ایک مثال سے سمجھ میں آجائے گی۔ یہی استعارہ جسے حضرت علاّمہ نے ان اشعار میں سرفراز فرمایا ہے۔ حضرت جوشؔ ملیح آبادی نے اسے اپنانے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں:-

وداعِ طفلی و قربِ شباب کے باعث تیری نگاہ ہے یا وہ خیالِ دل افروز

بدل رہا ہو جو پہلو ضمیرِ شاعر میں اور آب و تاب سے موزوں نہ ہو سکا ہو ہنوز

تشریح بے سود ہے۔ ارباب ذوق خود فرق سمجھ سکتے ہیں۔ سچ فرمایا ہے حضرت علاّمہ نے کہ "آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار"

مضمون موزوں ہو کر کیا بننے والا ہے اور تم کیا ہو۔ لیکن اتنا کہہ کر فرشتوں کو ساکت ہی نہیں کر دیا گیا بلکہ اس کے ثبوت میں عظمتِ آدم کی ایک جھلک بھی دکھا دی۔ اسے علّم الاشیاء۔ علم الفطرت عطا کیا گیا۔ اور فرشتوں سے پوچھا کہ تم بھی اس کی نسبت کچھ جانتے ہو؟ انہوں نے گردنیں جھکا دیں اور عرض کیا کہ حضور! لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ہمیں تو اتنا ہی پتہ ہے۔ جتنا ہمیں سکھایا گیا ہے۔ فرمایا کہ اب بتاؤ کہ یہ ہمارے رازوں کا امین۔ یہ عظمتوں کا پتلا اس قابل ہے یا نہیں کہ تم اس کے سامنے جھک جاؤ اب سوائے اعترافِ حقیقت کے چارہ کیا تھا۔ وہ جھکے اور بار بار جھکے حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ

کجا نورے کہ غیر از قاصدے چیزے نمی داند کجا خاکے کہ در آغوشِ دارد آسمانے را

بالِ جبریل میں فرماتے ہیں ۔ ؎

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

ذرا غور کیجئے اس فلسفہ پر۔ نظامِ فطرت کی ہر شے اس غرض سے پیدا کی گئی ہے کہ انسان اس سے کچھ کام لے یا وہ انسان کی کچھ خدمت بجا لائے۔ ان اشیاء کا وجود انسان کی زندگی اور زندگی کی ضروریات کے لئے ہے۔ ہوا نہ رہے تو انسان بھی نہ رہے۔ پانی نہ رہے تو انسان نہ رہے۔ لیکن اگر روئے زمین پر کوئی انسان باقی نہ رہے تو بھی یہ سلسلۂ کائنات اسی طرح جاری رہے۔ اس میں کوئی نقص واقع نہ ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کا وجود اس نظامِ کائنات کے لئے نہیں۔ اس کی تخلیق سے یہ غرض نہیں کہ یہ اسی دنیا کا ہو کر رہ جائے۔ دنیا اس کی خاطر ہے۔ یہ دنیا کی خاطر نہیں۔ یہ اس سے کسی بلند و بالا تر مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہی چیز اسے نظامِ کائنات سے ممتاز کرتی ہے۔ لیکن یہ شرفِ اجتباء۔ یہ امتیاز و خصوصیت محض ایک انسان کے گھر میں پیدا

ہوجانے سے ہی نہیں حاصل ہوجاتی۔ اس کے لئے ایک "یقین کامل" اور "عمل پیہم" کی ضرورت ہے جب کسی قوم میں یہ باتیں پیدا ہوجاتی ہیں تو وہ "خیر اُمت" بن جاتی ہے۔ اس کو حزب اللہ۔ اللہ والوں کی جماعت کہتے ہیں۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ کہ اس جماعت۔ اس حزب اللہ کا مقام کس درجہ بلند ہوگا۔ اس جماعت کے بھولے ہوئے فرد سے خطاب کرکے فرماتے ہیں۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تُو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تُو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا انہی کے لئے ہی تو ہے ؛

یہی وہ ہیں جن کے متعلق ارشاد ہے کہ

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا۔ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ ۳/۱۳۸	مت گھبراؤ مت خوف کھاؤ۔ تم تو دنیا میں سب سے بلند ہو بشرطیکہ تم مومن بن جاؤ ؛

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تُو ہے

مکاں فانی مکیں آنی۔ ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تُو ہے

تیری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تُو ہے

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا	اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بہترین قوم بنایا کہ تم تمام نوعِ انسانی

شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔ ۲/۱۴۳ | کے اعمال کے نگران رہو۔ اور تمہارے اعمال کے نگران رسولؐ ہوں ؛

مُسلم کی تو شان یہ ہے۔ کہ یہ تمام دنیا کی قوموں کے اعمال کا جائزہ لیتا رہے۔ دیکھتا رہے کہ کون ٹھیک کام کر رہا ہے۔ اور کون راستے سے ہٹ گیا ہے۔ یہ تو اقوامِ عالم کا نگران کار (Superviser) بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اور رسول اکرمؐ اس کے اعمال کے نگران۔ یعنی اس کے اعمال اسوۂ حسنہ کے تابع ہوں جو قرآن کی ہی تفسیر ناطق ہے۔ اور تمام دنیا کی اقوام اس کی روش کو اپنے لئے نمونہ قرار دیں کہ ہمیں یہ کچھ بننا چاہیئے۔ اور اس طرح ہر قوم اپنے اپنے اعمال کو اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لے کہ درست ہیں یا غلط۔ کس قدر درست ہے کہ ؎

جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تُو ہے

جب مومن کے علوِ مرتبت کی یہ شان ہو تو پھر یہ دنیاوی حکومت و ثروت اس کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہے۔ یہ تو بنی ہی اس کے لئے ہے۔ یہ تو اس کی وراثت ہے۔ کسی اور کے پاس جا ہی نہیں سکتی۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اس فقط کو دیکھیئے۔ کسی اور کا اس میں حصہ نہیں۔ یہ بطورِ حق کے اس پر قابض ہوگا۔ کوئی اور اسے اس سے چھین نہیں سکتا۔ اس لئے کہ یہ وراثت اسے اس مؤسّسِ اعلیٰؐ سے منتقل ہوتی چلی آئی ہے۔ جس کی شان میں ہے کہ نظامِ کائنات کی تخلیق کی غرض و غایت ہی وہ ہیں (حدیث لولاکؐ[1]) اسلئے

[1] ہمیں اس وقت اس مروّجہ حدیث کے صحیح یا ضعیف ہونے سے بحث نہیں حضرت علّامہ نے اس سے جو مفہوم لیا ہے۔ وہ عین قرآن کے مطابق ہے اور اسی لئے اس کا اطلاق بھی عمومی کر دیا ہے ؛

کہ جب یہ تمام کائنات ایک مردِ مومن کے لئے بطور خادم کے پیدا کی گئی ہے تو ایسا کہنے میں کیا مبالغہ ہے کہ وہ وجودِ اقدس و اعظم جو ایمان و عمل کا مظہرِ اتم تھا۔ وہی اس کی تخلیق کی غرض تھا۔ اس لئے حضرت علامہ ہر مومن کو صاحبِ لولاک کہتے ہیں۔ کہ نظامِ کائنات پیدا ہی ایک مردِ مومن کے لئے ہُوا ہے۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے۔ اور کس قدر سچا فیصلہ

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۔ ۲۱/۱۰۵	اور یقیناً ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد۔ لکھ دیا ہے کہ بیشک یہ تمام زمین ہمارے صالح بندوں کی میراث ہے ؃

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اور یہ اس لئے کہ مومن کی توبراری ہی دنیا میں کوئی نہیں کرسکتا۔ یہ تو اعلون ہے۔ سب سے بلند و بالاتر

مومنے بالائے ہر بالاترے غیرتِ او برنتابد ہمسرے

---

(۳)

یہ تو تھا اس دنیا کے متعلق۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ قرآن کریم کے نزدیک یہ زندگی تو حیاتِ انسانی کا اولیں گہوارہ ہے۔ عہدِ طفولیت ہے۔ اس نے تو ابھی جوان ہونا ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے نزدیک یہ زندگی۔ بایں ہمہ رعنائی و زیبائی۔ اصل معنوں میں زندگی کہلانے کی مستحق ہی نہیں۔ "زندگی" تو اس کے بعد آنے والی ہے۔

وَمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ ۚ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۔ ۲۹/۶۴	یہ زندگی تو محض کھیلنے کودنے کی زندگی ہے۔ بچپن کا زمانہ ہے ۔ زندگی تو درحقیقت اس کے بعد کی منزل ہے ؃

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ بتایا جائے کہ زندگی ایک مسلسل شے کا نام ہے۔ غیر منقطع۔ جہاں کوئی شے رُک جائے وہ اس کی موت ہوتی ہے۔

زندگانی از خرام پیہم است　　　برگ و سازِ ہستیٔ موج از رم است

موجودہ دورِ حیات کے دورِ لہو و لعب ہونے کے متعلق ارشاد ہے۔

زمین خاکِ درِ میخانۂ ما　　　فلک یک گردشِ پیمانۂ ما

حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است　　　جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

ذرا اس "خاک درِ میخانہ" اور "گردش یک پیمانہ" کے ٹکڑوں کو دیکھئے اور پھر سامنے لائیے۔ آیت مذکورہ کے اس حصہ کو کہ وما ھٰذہ الحیٰوۃ الدنیا الا لھو ولعب اور اس "دیباچۂ افسانۂ ما" کے ساتھ وَاِنَّ الدَّارَ الاٰخرۃ لَھِیَ الحیوان کو۔ یہ موجودہ زندگی تو محض دیباچہ ہے۔ اصل کتاب تو ابھی شروع ہونے والی ہے ؎

ہر چند مضمون طویل ہو رہا ہے۔ لیکن جی نہیں چاہتا کہ ایک چیز سامنے آجائے اور اسے یونہی چھوڑ کر آگے گذر جائیں۔ "حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است" کے لئے مجھے نظریۂ ارتقا بیان کرنا چاہئے لیکن جیسا کہ پہلے میں عرض کر چکا ہوں۔ یہ ایک الگ موضوع ہے جس کا ضمناً لکھنا دشوار ہے۔ یہاں صرف حضرت علامہ کے اس مصرع کے متعلق کچھ اشارات ضروری ہیں۔ قرآن کریم میں ارتقاء کے ضمن میں یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالےٰ ایک تدبیر (Plan) کرتا ہے۔ پھر اس تدبیر کو پختگی کی حد تک پہنچانے کے لئے اسے مختلف مراحل طے کراتا ہے۔ قطرہ کو گہر ہونے تک گوناگوں مقامات میں سے گذرنا ہے۔ ایک ایک مقام اور ایک ایک منزل کا نام یوم ہے۔ (بمعنی دن) لیکن یہ ایام ہمارے گردشِ لیل و نہار کے

ایام نہیں۔ بلکہ ان کا طول ہمارے حساب سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ۔	وہ آسمان سے زمین کی طرف تدبیر امور کرتا ہے۔ پھر وہ امر پختگی
ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ	اختیار کرکے) اس کی طرف بلند ہوتا ہے ایک دن میں جس کی مقدا
اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۳۲/۵	انسانوں کے اعداد و شمار کے لحاظ سے۔ ہزار سال ہو سکتی ہے ؛

دوسری جگہ ہے کہ بعض ایام پچاس پچاس ہزار سال کے بھی ہوتے ہیں۔ اسی کرۂ ارض کو دیکھئے۔ اپنی اصل سے الگ ہونے کے بعد (جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے) کتنے عرصۂ دراز میں اس قابل ہوئی ہوگی کہ اس پر کوئی ذی روح آباد ہو سکے۔ اسی طرح انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کتنی منازل طے کرنی ہوں گی۔ اور اس میں کتنا وقت صرف ہوگا۔ اب پھر دیکھئے کہ

حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است

کس قدر سچی حقیقت ہے۔ اور کس قدر لطیف پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ اسی کو دوسری جگہ ذرا زیادہ شوخی سے لکھتے ہیں کہ

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں　　کارِ جہاں دراز ہے۔ اب میرا انتظار کر

ہاں! تو کہنا یہ تھا کہ موت۔ زندگی کو ختم کرنے والی شئے نہیں۔ بلکہ یہ تو ایک نئی زندگی کا دروازہ ہے۔

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است　　زندگی در پئے تعمیر جہانِ دگر است

اسی عنوان پر دو ایک شعر اور بھی دیکھتے جائیے۔ کبھی شعروں کو دیکھئے اور کبھی اپنے قلب و دماغ کو کہ ایک ہی ثانیہ میں ان اشعار نے انہیں علم و ادراک کی کن بلندیوں اور کیف و نشاط کی کن جنتوں میں پہنچا دیا۔ ایسے ایسے شعر کہہ دینا درحقیقت فیضان ہے اس کتاب مبین کی ضیا پاشیوں کا کہ جس کا دعوےٰ

ہے۔ کہ آؤ۔ تمام نوع انسانی مل کر اس کی ایک سورت کی مثل کوئی چیز پیش کر کے دکھاؤ۔ ایسے شجر طیب کے برگ و بار بھی ایسے ہی ہونے چاہئیں۔ فرماتے ہیں ؎

خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے ‏ ‏ ‏ ذرۂ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر

پیامِ فرنگ کے دو شعر ہیں ؎

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود ‏ ‏ ‏ این مئے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود

شعلہ بودیم و شکستیم و شرر گردیدیم ‏ ‏ ‏ صاحبِ ذوق و تمنا و نظر گردیدیم

اس آخری شعر کو ملاحظہ فرمایئے۔ شعلہ کی شکست اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ خاکستر بن کر رہ جائے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں پہلے سے بھی زیادہ تڑپ، چمک، حرارت پیدا ہو جائے۔ انسانی ہیولیٰ میں ہر چند "نورانیت" کا عنصر موجود ہے۔ لیکن ابھی "مادیت" کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ اس لئے حقایقِ اشیاء پر ظلمتوں کے پردے پڑے رہتے ہیں۔ اس ہیولیٰ کی شکست اس لئے ہو گی کہ اس کے بعد شعلہ کی حرارتیں سمٹ کر شرر بن جائیں۔ اور وہ اس آتشدانِ خاکی سے اڑ کر فضائے نور کی ان وسعتوں میں جا پہنچے جن کے لئے لا شرقیہ و لا غربیہ آیا ہے۔ جو کائنات (space) کے موجودہ تصورات کے دائرہ سے باہر ہیں۔ یعنی ادھر سے سکراتِ موت کی ہچکی آنکھ بند کرے اور اُدھر سے نورانی ملائکہ استقبال کے لئے آجائیں۔ کہ حضور آئیے۔ تشریف لائیے۔ دیدہ و دل فرشِ راہ۔ یہ نورانی وادیاں۔ یہ دل و نگاہ کو سکون و اطمینان کی ٹھنڈک پہنچانے والی حسین جنتیں آپ کے انتظار میں ہیں۔

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ طَیِّبِیْنَ ـ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْکُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّۃَ	یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ملائکہ نہایت آسودگی کی حالت میں وفات دیتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ تم پر سلامت و رحمت ہو۔ آیئے

بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔ ۱۶/۳۲ جنت میں داخل ہو جائیے ۔ بوجہ ان اعمال کے جو تم نے کئے ہیں

اس آیت کو سامنے رکھئے اور پھر اس شعر کو پڑھئے کہ

شعلہ بودیم و شکستیم و شرر گردیدیم
صاحب ذوق و تمنا و نظر گردیدیم

پھر جنت کے متعلق جو اس آیت میں ۔ اور دیگر متعدد آیات میں ۔ آیا ہے کہ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔ یعنی جنت اعمال کی جزا ہے ۔ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ
تا جزائے عمل تست جناں چیزے ہست

زندگی کے تسلسل کے متعلق غزل کا بھی ایک شعر سنئے اور دیکھئے کہ غزل کی رنگینی باقی رکھتے ہوئے بھی حقایق کیسے بیان کئے جا سکتے ہیں ۔ فرماتے ہیں ۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جواب مشکل ہے یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

قیامت کے متعلق قرآن کریم میں ہے ۔ کہ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ جب نفوس کو دوبارہ اٹھایا جائیگا خاک اپنی پریشانی کے بعد پھر سے "دل" بن جائے گی ۔ اس غزل کا دوسرا شعر ہے ۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

اس شعر میں انسان (آدم) کے ہبوط و صعود کی حقیقت کس قدر دلآویز پیرایہ میں بیان کی گئی ہے تخلیق آدم کا قصہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں ۔ اس کے بعد ہبوط آدم کا ذکر ہے ۔ ہبوط کے معنی نیچے گرنے کے ہیں ۔ آدم کے جنت سے نکلنے کے لئے قرآن کریم نے خروج (نکلنا) کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ ہبوط (نیچے گرنے) کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ اس ہبوط کی رعایت سے آدم کو ٹوٹا ہوا تارہ کہنا کس قدر موزوں ہے کہ تارہ جب ٹوٹتا ہے تو نیچے گرتا ہے ۔ پھر حضرت آدم نے اپنے ہبوط کا جواز بیان کیا تھا وہ یہ تھا کہ

اسے بارِ آلہ! اگر ہماری توبہ قبول نہ ہوئی۔ اگر ہمیں اپنی اصل حالت میں نہ پہنچایا گیا تو لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ۔ ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوجائیں گے۔ ٹوٹا پانے والوں میں سے ہوجائیں گے۔ اس ہبوط کے بعد۔ ان تمام ارتقائی منازل کو طے کر کے پھر ایسا عروج حاصل کرنا کہ تارہ۔ مہ کامل بن جائے۔ اسکی عظمتیں اور رفعتیں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائیں۔ یہ ہے وہ راز جو ملائکہ کی نگاہوں سے اوجھل تھا اور جس کی وجہ سے یہ انجم یوں سہمے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔	بے شک ہم نے انسان کو بہترین ہیئت کذائی میں پیدا کیا۔ پھر
ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ	اسے (اس کے اعمال کی بدولت) نچلے سے نچلے درجہ میں لوٹا دیا
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ فَلَهُمْ اَجْرٌ	مگر سوائے ان کے جنہوں نے ایمان کے ساتھ اعمال صالح کئے
غَیْرُ مَمْنُوْنٍ۔ (والتین)	پس ان کے لئے غیر منقطع اجر ہے ۔

انسان میں ایمان و عمل صالح پیدا ہونے دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ یہ شہباز کن بلندیوں پر اڑتا ہے۔ ایسی فضاؤں میں جو حدود نا آشنا ہیں (غیر ممنون)۔ اسی پرواز کی پہلی منزل ہے جس کے متعلق فرماتے ہیں۔

برجیسے کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد　　این مشتِ غبارے را انجم بسجود آمد

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہی فرق ہے یورپ کے نظریۂ عروج اور ایک مسلم کے نظریۂ عروج میں۔ یورپ کا مادہ پرست انسان کی پرواز اس دنیا۔ یا زیادہ سے زیادہ کسی قریبی ستارے مثلاً مریخ وغیرہ تک سمجھتا ہے اور وہ بھی محض جسمانی پرواز۔ جو پھر مادی پرواز ہی ہے اور اس زندگی سے متعلق ہے لیکن قرآن کریم انسان کو بہت اونچا لے جاتا ہے کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ ایسے مبارک درخت کی طرح جس کی جڑیں مضبوط ہوں۔ اور جس کی شاخیں آسمان کے اوپر ہوں۔ اسلئے حضرت علامہ فرماتے ہیں۔ کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن　　قدم اُٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

اس چیز کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں　　ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں　　یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر　　چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا　　ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا　　کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

ارتقائی منازل کو "عشق کے امتحاں" کہنا خشک فلسفہ کو کس قدر شیریں بنا دیتا ہے۔ دوسرے شعر میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ کہ یہ بلندیوں کی فضائیں جنہیں قرآنی اصطلاح میں سمٰوٰت کہا جاتا ہے آبادی سے خالی نہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ۔ $\frac{42}{29}$	اللہ کی نشانیوں میں سے یہ (بھی) ہے۔ کہ اس نے زمین و آسمان پستیوں اور بلندیوں۔ کو پیدا کیا۔ اور ان دونوں میں جو جاندار پھیلا دیئے وہ بھی ٭

اس شعر کے دوسرے مصرع میں ان آباد فضاؤں کو کارواں کہا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ اور ہم نے تمہارے اوپر سات (یا متعدد) رہگذر بنائے۔ یہ رہگذر کاروانوں ہی کے لئے تو ہیں۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کارواں در کارواں ہجوم کون کون سی ارتقائی منازل طے کرتے پھر رہے ہیں عشق کی کون کون سی وادیوں میں سرگرداں ہیں۔ پھر چونکہ یہ تمام آبادیاں

ایک جوئے رواں کی طرح ہر وقت مصروفِ خرام ہیں۔ قطع منازل کر رہی ہیں۔ اس لئے ان کو کارواں کہنا ایسا حسین انداز ہے۔ جس کی داد غالبؔ ہی دے سکتا تھا۔

شعر جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ انہی جذبات سے اس میں دلکشی اور سوز و گداز پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جب شعر میں حقایق بیان کئے جائیں۔ یا اس کا انداز مصلحانہ اور پیامی ہو جائے تو پھر اس میں بالعموم شعریت باقی نہیں رہتی۔ پھر یا تو وہ شعر اس انداز کا ہو جاتا ہے کہ ؎

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

یا اس انداز کا۔

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ ہے برا وہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے

اور گر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے کیوں برا کہنے سے تو اسکے برا مانتا ہے

اور ایک ذوقؔ ہی پر کیا موقوف ہے۔ بڑے بڑے عمدہ شعر کہنے والے جب تبیانِ حقایق یا مصلحانہ انداز میں اترتے ہیں۔ تو شعر بے جان ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ خصوصیت حضرت علامہؒ ہی کے حصہ میں آئی ہے کہ حقایق۔ اور حقایق بھی اس درجہ دقیق۔ بیان کئے جاتے ہیں۔ اور شعر کے حسن میں بھی کوئی کمی نہیں آتی۔ ذَالِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ

ستاروں کی دنیا کے متعلق زبورِ عجم میں فرماتے ہیں۔

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ماست کہ ہر ستارہ جہان است و یا جہاں بود است

ہاں! تو زندگی ایک مسلسل خرام کا نام ہے۔ چلتے جانا۔ بڑھتے جانا۔ اور بڑھتے جانا . . . . . بڑھتے ہی چلے جانا کہ ؎

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا　　　حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

جسے مقام سمجھا جاتا ہے وہ مقام نہیں۔ جسے منزل کہا جاتا ہے وہ منزل نہیں۔ یونہی ذرا استانے۔ دم لینے کے لئے۔ گھنے درختوں کا سایہ ہے۔ کاروان کے دوپہر کاٹنے کے لئے نخلستان ہے۔ وہ جنت کہ جسے بالعموم منزلِ مقصود سمجھا جاتا ہے۔ راستہ کی خوشگوار وادی ہے۔ کہ جنت میں پہنچ کر بھی اہلِ جنت کی یہ کیفیت ہوگی کہ۔

يَسْعَىٰ نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِم [۵۷/۱۲] | ان کا نور ان کے آگے۔ اور ان کے دائیں کی طرف چلتا ہوگا۔

یہ نور۔ پیشانی کی روشنی۔ یہ سرچ لائٹ۔ بالآخر اگلی منزل کا راستہ دکھانے کے لئے ہی تو ہوگی۔ وہ راستہ جس کے متعلق ارشاد ہے۔ کہ جنت میں پہنچ کر بھی ... وَهُدُوا إِلَىٰ صِرَاطِ الْحَمِيدِ ان کی ایک پسندیدہ راستہ کی طرف رہنمائی کی جائے گی [۲۲/۲۴]۔ دنیا میں صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعا تھی۔ ایک سیدھے راستے پر چلنے کی۔ وہاں ایک پسندیدہ راستے پر چلائے جائیں گے۔ اس لئے جنت مقام نہیں۔ راہ گذر ہے۔ وہاں سے بھی انسان کو آگے بڑھ جانا ہے۔

اگر عنانِ تو جبریل و حور می گیرند　　　کرشمہ بر دلِ شاں ریز و دلبرانہ گذر

کہ ملائکہ کا تو یہ ٹھہرا مسجود۔ اُن کا مقام اس کا مقام کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہ تو وہ "شکار" ہے جس کا اٹھانا بھی تضیعِ اوقات ہے۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے　　　یزداں بہ کمند آور۔ اے ہمتِ مردانہ

لیکن جاییں ہمہ۔ انسان "لامکان" نہیں۔ ہر اک مقام سے آگے ہی سہی۔ لیکن مقام اس کا ضرور ہے وہ مقام کیا ہے؟ وہ منزلِ مقصود کونسی ہے!! یہ راز ہے جسے کھول کر بیان نہیں کیا گیا۔ نہ ہی اس کی

آج ضرورت تھی۔ آج تو صرف یہ دیکھنا ہے۔ کہ انسان کی موجودہ زندگی کے بعد اگلی منزل کونسی ہے۔ سو اس کی تفصیل شرح وبسط سے قرآن کریم میں موجود ہے۔ اس منتہٰی کے متعلق تو سردست اتنا ہی کہا گیا ہے کہ وَاِلٰی رَبِّکَ مُنْتَہٰـہَا اس کا منتہٰی تیرے رب تک ہے۔

شعلۂ در گیر زد بر خس و خاشاک من مرشدِ رومی کہ گفت۔ منزلِ ما کبریاست

لیکن یہاں پہنچ کر حضرت علامہ واصل با الحق کے عقیدہ کا اتباع نہیں کرتے۔ کہ قرآن کریم کے رُو سے انسان کے خدائے واحد کی ذات میں جذب ہو جانے کے عقیدہ کی سند نہیں ملتی۔ لیکن حضرت علامہ اس عقیدہ کے اختلاف میں بھی ایک شانِ انفرادیت پیدا کر لیتے ہیں۔ اور اسے انسان کی خودی محکم بالذات ہونے کے منافی سمجھتے ہیں کہ وہ کسی کی ذات میں گم ہو جائے۔ خواہ وہ خدا ہی کی ذات کیوں نہ ہو۔ ان کے نزدیک عشرتِ قطرہ دریا میں فنا ہو جانا نہیں۔ بلکہ تہِ دریا گُہر بن کر بیٹھ جانا ہے۔ فرماتے ہیں۔

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی ترا او بیند و اورا تو نہ بینی
بخود محکم گذار اندر حضورش مشو ناپید اندر بحرِ نورش

"ترا او بیند" تو ہر وقت کا معاملہ ہے۔ وہ کونسا لمحہ ہے جب خدا انسان کو نہیں دیکھتا لیکن "اورا تو بینی" کا مقام اس منزل سے آگے آتا ہے۔ موجودہ مقام میں تو ایک اولوالعزم پیغمبر نے جب یہ آرزو کی کہ ربِّ اَرِنی۔ تو جواب مل گیا کہ لن ترانی (تو مجھے نہیں دیکھ سکتا) لیکن اس سے اگلی منزل میں مومنین کی یہ کیفیت ہو گی کہ

وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ	بہت سے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہونگے ؀

اب خدا بندے کو دیکھ رہا ہے۔ اس وقت بندہ بھی خدا کو دیکھے گا۔ کہ

عبد و مولا در کمین یک دگر　　ہر دو بے تاب انداز ذوقِ نظر

زندگی ہر جا کہ باشد جستجو ست　　حل نشد این نکتہ من صیدم کہ اوست

اگر ایک طرف انسان کی تڑپ اور تجسس کا یہ عالم ہے کہ اِلٰی رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ اپنے رب کی طرف رواں دواں جائیں گے۔ تو دوسری طرف یہ کیفیت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا اور تیرا رب اور فرشتے قطار در قطار (زمین پر) آئیں گے۔ کہ

ہر دو بے تاب انداز ذوقِ نظر

---

(۴)

لیکن یہ تمام مراحل طے کس طرح ہوں گے؟ "یہ محکم خودی" حاصل کیسے ہوگی!! یہ اس دنیا میں اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ہونا یعنی ایسا سخت ہو جانا کہ کوئی اسے ہضم نہ کر سکے۔ کوئی اپنے اندر جذب نہ کر سکے۔ یہ کیسے ہوگا!!! اس خاک کے تودے میں فولادی جوہر کیونکر پیدا ہونگے! یہ نازک سا شیشہ اپنے اندر ایسی سختی کیسے پیدا کرے گا کہ اس کا "زجاج حریفِ سنگ" ہو جائے۔ اس کے لئے رموز و اسرار میں پورا لائحہ عمل مرتب کر کے دے دیا گیا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں۔ لیکن اس سب کا ماحصل ایک نکتہ ہے۔ اور یہی نکتہ دراصل کلامِ اقبال کا محور ہے۔ مرکز ہے۔ محیط ہے۔ سب کچھ ہے۔ یہ نکتہ ہے۔ محمد الرسول اللہ۔ فرماتے ہیں۔

تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تُو　　فروغِ دیدۂ افلاک ہے تُو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حُور　　کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تُو

بس یہ ہے راز ایک مومن کی پختگی کا۔ اس کی خودی کے استحکام کا۔ کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تُو تو ان مقدس ہاتھوں کا پروردہ ہے۔ جن کی شان میں آیا ہے کہ یَدُ اللہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (الفتح) تُو تو اس ذاتِ گرامی کا شاہین ہے۔ جو دانائے سبل۔ ختمِ رُسل۔ مولائے کل ہے۔ جو معراجِ انسانیت کا مظہر کامل ہے۔ جب تو ایسی رفیع الشان بارگاہ کا شاہین ہے۔ تو تیرے عرش آشیاں ہونے میں کیا کلام ہے۔ لہٰذا یہ تمام فضائیں اور فضاؤں کی پہنائیاں۔ اور یہ سب پستیاں اور تمام بلندیاں یہ ارض و سمٰوات۔ یہ تمام کائنات اور اس کی قیود نا آشنا وسعتیں۔ اس شاہینِ شہ لولاک کے بازوؤں کے نیچے کیوں نہ ہوں۔ اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک رسولؐ کی اطاعت عشق کے مرتبہ تک نہ پہنچ چکی ہو۔ کہ رسولؐ کی اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت ہے اور یہ اطاعت قرآن کی اطاعت سے میسر ہوتی ہے کہ حضورؐ قرآن ہی کی اطاعت سکھانے کو تشریف لائے تھے۔

"قسم ہے تیرے پروردگار کی۔ ان میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے ان تمام معاملات میں۔ جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ اے رسول۔ تمہیں اپنا حاکم تسلیم نہ کریں۔ پھر تمہارے فیصلوں پر دل میں بھی کوئی تنگی اور گرانی محسوس نہ کریں۔ بلکہ ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیں۔" ۴/۶۵

اسی ایک نکتہ کے اندر امارت کی مرکزیت۔ امیر کی اطاعت۔ وحدتِ افکار و عمل اور ان کے جیتے جاگتے نتائج۔ یعنی تمکن فی الارض۔ استخلاف فی الدین۔ حکومت و سطوت۔ زمین پر "آسمانی بادشاہت" کا قیام

سرفرازیاں اور سربلندیاں۔ کامیابیاں اور کامرانیاں۔ اور اس کے بعد حیاتِ اخروی ہیں۔ بعد کی منزل ہیں۔ آگے بڑھنے کی قوتیں۔ مدارجِ عالیہ۔ یہ سب کچھ اسی کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے ضمناً اس مبحث کو یہاں چھیڑ دینا پڑا۔ ورنہ یہ تو وہ عنوان ہے جس پر کلامِ اقبال سے ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ اقبال کی تمام شاعری اور شاعری کا سوز و گداز رہینِ کرم ہے محبتِ رسولؐ کا۔ جذبۂ اطاعت کا۔ اسی ذاتِ گرامی کے شعلہ ریز لب پہ ہے جس نے اقبال کو اقبال بنا دیا۔ ورنہ یہ بھی کہیں "میر مشاعرہ" ہوا کرتے۔ جذبۂ اطاعتِ رسولؐ نے (جسے وہ عشق کہتے ہیں) اقبال کو اس انداز سے گداز کر رکھا ہے کہ اس کے بربطِ ہستی کے کسی تار کو چھیڑیئے۔ اس میں سے نغمہ وہی پیدا ہوتا ہے۔ اسی چیز نے ان کے سامنے قرآنی حقایق کو بے نقاب کیا اور قرآنی حقایق نے ان کے کلام میں دمِ مسیحا اور ضربِ کلیم کے اعجاز پیدا کر دیئے۔ فطرت کی کرم گستری نے وہ دماغ کیا تھا جو یکسر علم و حکمت تھا۔ محبتِ رسولؐ کی موہبتِ عظمےٰ سے وہ قلبِ منور مل گیا جسے صہبائے ایمان کا مقدس آبگینہ کہنا چاہیئے ان دونوں کے امتزاج سے وہ نگاہ پیدا ہوئی جو اشیاء کی حقیقت کو بے نقاب دیکھ لے۔ جو گل و خار کے نظر فریب امتیاز سے ہٹ کر شاخِ گل کے اندر جا کر مشاہدہ کرے کہ "درونِ او نہ گل باشد نہ خار است" اس نگہِ حقیقت شناس کا نام ہے اقبال۔ یعنی قلب و دماغ کا مجموعہ۔ ایمان و حکمت کا فشردہ۔ زیرکی و

لہ نظامِ اسلامی کی رو سے کس طرح امامِ منفقٌ علیہ (یعنی مرکزِ ملت) کی اطاعت۔ اطاعتِ خدا اور رسولؐ کے مرادف ہو جاتی ہے قرآن کریم میں بصراحت اس کی تشریح موجود ہے۔ اسی جذبۂ اطاعت کے اندر قوموں کی زندگی کا راز ہے۔ اور اس کو بھلا دینے سے مسلمانوں کی آج یہ حالت ہو رہی ہے۔ اطاعت جب خوف و ترہیب سے بلند اور مزد و معاوضہ سے بے نیاز ہو جائے۔ تو عشق بن جاتی ہے +

عشق کا عصارہ۔ اویس و بوعلی کا مرکب مجسمہ۔ رومی و رازی کا مشترکہ شاہکار۔ وہ مشرق و مغرب کا مقامِ اتصال۔

غربیاں را زیرکی رازِ حیات — شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس — کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ — عشق را با زیرکی آمیز دہ

اور یہی وہ امتزاجی کیفیت ہے جو قرآن کریم ایک مومن کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مظاہر فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں کے بعد فرمایا

اِنَّ فِی ذَالِکَ آیَاتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ۔	بے شک (ان مظاہر فطرت) کے اندر صاحبان عقل وخرد کے لئے آیات ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو اللہ کو کھڑے۔ بیٹھے۔ اور لیٹے یاد کرتے ہیں ؛

یہ عقل و ہوش کے ساتھ خدا کو یاد کرنے والے" وہ مومن ہیں جنہیں نوعِ انسانی کے لئے نمونہ بنایا گیا ہے۔

اور پھر سحابِ فطرت کا کرم بالائے کرم کہ اس نگۂ حقیقت بین کو اظہارِ مشاہدات کے سلئے ذریعہ بھی ایسا حسین و دلکش عطا کر دیا کہ جو دیکھے، کھنچا چلا آئے ... بشرطیکہ وہ کہیں سے بوجہل و بولہب کی ہی آنکھیں نہ مانگ لایا ہو۔ اور پھر تماشا یہ کہ یہ ملکوتی کام لیا اس شاعری سے جس کے علمبردار ابھی تک اس "تحقیق انیق" سے ہی فارغ نہیں ہو سکے کہ بلبل مذکر ہے یا مؤنث۔ سچ ہے جب خدا چاہے تو ایک خشک لکڑی سے وہ کام لے لے کہ وہ کذب و باطل کے بڑے بڑے اژدھوں کو نگل جائے۔ یہ اور بات ہے کہ قومِ اقبال کو بھی ایسی ہی ملی ہو جو قومِ موسٰے کی طرح کہہ دے کہ فَاذْھَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ وَاِنَّا ھٰھُنَا قَاعِدُوْنَ

جا۔ تو اور تیرا رب لڑو جاکر۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں جب فتح ہو جائے تو آواز دے دینا۔ بایں ہمہ یقین مانئے جس طرح قرآن کریم نے عرب کی شاعری کے دورِ جاہلیت کو ختم کرکے اسی قوم سے ایک ایسا خمیر تیار کر دیا تھا کہ وہ جس آٹے میں جاکر ملے اس میں بھی خمیر کی کیفیت پیدا کر دے۔ وہ قوم کہ جسے چشم فلک نے ایک بار دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ سرگرداں ہے۔ اقبال نے بھی مشکوٰۃ قرآن کی روشنی میں عجمی شاعری کے "دورِ جاہلیت" کو ختم کرکے ان کے افیونی اعصاب میں ایسا خون دوڑا دیا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب یہ زمین بدل جائے گی۔ یہ آسمان بدل جائے گا اور مسلمان پھر یہ کہنے کے قابل ہو جائے گا۔

زمین از گردشِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے　　فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے[1]

---

[1] اس حصہ مضمون کو ایمان کے عنوان کا ایک ٹکڑا سمجھنا چاہیئے۔ میں نے اسے مقدم اس لئے رکھا ہے۔ کہ ایمان ہی تمام اعمال کی اساس ہے۔

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے　　یہ وہ قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

اعمال کا عنوان اس کے بعد آتا ہے۔ اسے ہم کسی دوسری فرصت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ۔



علامہ سر محمد اقبال

اقبال اور فلسفہ مغرب

(از حفیظ ہوشیارپوری۔ ایم۔ اے)

میں نے ۱۹۳۶ء میں فلسفیانہ نظموں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس سے مراد یہ تھی کہ فلسفے کے کسی خاص مسئلے کے متعلق حضرت علامہ اقبالؒ اور مغرب کے کسی فلسفی کا نظریہ مکالمے کی صورت میں پیش کیا جائے۔ تاکہ پڑھنے والوں کو مختلف مسائل کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس کے لئے میں نے علامہ مرحوم سے اجازت طلب کی تھی۔ جس کے جواب میں انہوں نے تحریر فرمایا تھا:۔

"آپ کا خیال بہت اچھا ہے مگر اردو میں خیالات کا ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ اسکے لئے آپکو بہت غور و فکر کرنا ہوگا۔ بہ حیثیت نظم "عزم للحیات" اوروں سے بہتر ہے۔"

افسوس کہ گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے میں یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکا۔ اب انشاء اللہ اس کی طرف پھر توجہ کروں گا۔ یہ نظمیں اس سلسلے کی پہلی دو کڑیاں ہیں۔

(ح۔ ہ)

"عزم للحیات"

شوپنہار

دُنیا فریب و مکر و ریا، درد و رنج و غم!
حرص و ہوا و کشمکش "عزم للحیات"!

تسکینِ جاں ہیں فلسفہ و علم و شعر و فن
ممکن نہیں ہے آہ مگر ان کو بھی ثبات!

فطرت ہے طفل اور جہاں بلبلوں کا کھیل!
کھلتا نہیں ہے مقصدِ تخلیقِ کائنات

اندوہِ بے کراں سے عبارت ہے زندگی
شاید کہ بعدِ مرگ بشر کو ملے نجات!

اقبال

اے "عزم للحیات" کے معنی سے بے خبر
آ میں بتاؤں رازِ سرا پردۂ حیات

افسانۂ زبونیٔ ہمت ہیں علم و فن
حاصل ہیں فلسفے کا پریشاں توہمات

تیغِ خودی سے جوہرِ ہستی کی ہے نمود
تیغِ خودی سے زندہ حقیقت ہے کائنات

اس تیغ میں ملے گی اماں تجھ کو بالیقیں
کیوں ڈھونڈتا ہے موت میں اپنے لئے نجات؟

خدا

نطشے

عالمِ امکاں کی ہر شے بے ثبات! — زندگی کیا ہے؟ فقط افسانہ ہے!
اک معمّہ ہے شبستانِ حیات — تیرہ و تاریک یہ کاشانہ ہے
مجھ کو بُوئے آشنا آتی نہیں — کس قدر اس کی فضا بیگانہ ہے
کیا وہی ہے اہلِ مذہب کا خدا — جس کی صنعت آہ یہ ویرانہ ہے؟
ہائے وہ شب زندہ دارِ سادہ دل! — شمع ناپیدا کا جو پروانہ ہے

اقبال

زندگانی کی حقیقت کو سمجھ — یہ صدف، تو گوہرِ یکدانہ ہے
تیرے سینے میں نہیں شمعِ یقیں — اس لئے تاریک یہ کاشانہ ہے
کس طرح پائے سُراغِ آشنا — تُو کہ اپنے آپ سے بیگانہ ہے
اُس کے دل پر فاش ہے سرِّ نہاں — شمع ناپیدا کا جو پروانہ ہے
تُو تلاشِ جلوۂ جاناں میں گم — وہ شہیدِ جلوۂ جانانہ ہے

شاعرِ ربّانی

از

راجہ حسن اختر۔ بی۔ اے۔ پی سی ایس

اقبالؔ کی شاعری اسلام کے ضمیر پاک سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے نظریہ کے مطابق شاعر قوم کے دل اور نگاہ سے مشابہ ہے۔ یہ نظریہ اس کی اپنی شاعری پر پورے طور پر صادق آتا ہے۔ اقبالؔ کی ربانی حکمت کے بغور مطالعہ سے انسان بآسانی سے اس یقینی نتیجے پر پہنچ جاتا ہے۔ کہ وہ عصر حاضرہ میں ملت اسلامیہ کا دل اور نگاہ ہے۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ کم ہیں۔ جو اقبالؔ کے علم و بصیرت اور فکر و تدبّر کے قائل نہ ہوں۔ ایک گروہ ایسا ضرور ہے۔ جس کا از راہ اخلاص یہ خیال ہے۔ کہ عجمی اور ہندی شاعری کی روایات بالکل فاسد اور مہلک ہیں۔ اس لئے اقبالؔ اپنا پیغام اگر نظم کی بجائے نثر میں دیتے۔ تو زیادہ مؤثّر اور نتیجہ خیز ثابت ہوتا۔ اقبالؔ کا شاعری کو ذریعۂ پیغام بنانا۔ اس کی فطرت کا ایک سربستہ راز ہے لیکن اس کی ظاہر وجہ یہ ہے۔ کہ شعر اپنی کیفیت کے اعتبار سے بہت ہی سریع الاثر ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ سامع کو اطلاع ہو۔ یہ کانوں کے ذریعے اس کے دل میں اُتر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نفع یا ضرر بہت زیادہ ہے۔ ایک دفعہ حضور سرورِ کائنات نے فرمایا کہ ہر آدمی کا شیطان خون کی طرح اس کے رگ و ریشے میں جاری ہے۔ ایک صحابی نے عرض کیا۔ کہ جناب کے شیطان کی کیا صورت ہے

جواب فرمایا۔ کہ "اسلم الشیطان علیٰ یدی " یعنی میرا شیطان میرے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔ اقبالؔ نے بھی اس شیطان کو جس نے ہمارے دین و اخلاق کو بازیچۂ اطفال بنایا ہوا تھا۔ مسلمان بنا کر ہماری قومی تعمیر کی خدمت میں لگا دیا۔ لچر اور پوچ عجمی خیالات جن کے بے اصل اور بے بنیاد ہونے میں کسی کو بھی شبہ نہیں۔ شعر کا حسین اور نظر فریب جامہ اوڑھ کر ابدی طور پر ہمارے دل اور دماغ میں سرایت کر گئے ہیں۔ اس نے جب چاہا جنون کو خرد اور خرد کو جنون کہہ دیا۔ اس کے نزدیک دانۂ انگور کا ٹوٹ کر شراب بننا ایسا ہے۔ گویا ستارے ڈھل رہے ہیں۔ اور آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ یہ جب چاہے معشوق کے ایک تل کے بدلے سمر قند اور بخارا بخشنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے فرضی محبوب کے خدوخال کے اسلحہ خانے میں اس قدر تیر۔ تلواریں اور کمندیں موجود ہیں۔ جو اپنوں بیگانوں سب کو ہلاک کر دیں۔ یہ زندگی کی سطحی لذتوں کو نقد اور اخروی کامرانیوں کو ادھار کہہ دیتا ہے۔ اس کے سایہ کے اندر گناہ اپنے آپ کو ثواب اور ثواب گناہ سمجھنے لگ پڑتا ہے۔ اس عجمی کانِ نمک کے اندر ہمارے جو اہل ہنر داخل ہوئے۔ خود نمک ہو کر رہ گئے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذتِ شربِ دوامِ ما
(حافظ)

ایک کا ارشاد ہے ؎

چوں اہلِ دل ز دل افسانہ گویند
حدیثِ بلبل و پروانہ گویند
(جامی)

ایک کا شکوہ ہے ؎

زشعرِ من شدہ پوشیدہ فضل و دانشِ من
چوں میوۂ کہ بماند بزیرِ برگ نہاں
(غنی کاشمیری)

ایک کا عذر ہے ؎

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
(غالب)

ان حضرات کے تخیل کی رنگین اور دلفریب غلام گردشوں میں آپ تشریف لے جائیں اور دیکھیں۔ کہ پرانے عجمی اسلوب فکر کے ساغر کے اندر کس حد تک آپ کو عکس رخِ یار نظر آتا ہے۔ تو ہیں جب فتوحات سے تھک جائیں۔ تو ممکن ہے۔ اس قسم کا حب افیون ان کے لئے جائز ہو۔ ایسا بھی اسی صورت میں گوارہ ہو سکتا ہے۔ کہ یہ طرز ان کی زندگی کے محکمات کے ساتھ تصادم نہ پیدا کرے لیکن مرض اور غلامی کے زمانے میں اس کے جواز کی مثال ایسی ہی ہے۔ گویا ایک جاں بلب مریض کو اس کے آخری سانس یا ایک خانہ برباد مزدور کو اس کے آخری سہارا سے محروم کر دیا جائے۔ اب تک یہ سب کچھ کھلے بندوں ہو رہا تھا۔ ہم زہر ہلاہل پی رہے تھے ہم گھر پھونک تماشہ دیکھ رہے تھے کسی کو اس سحر مبین کے سامنے جرأت گفتار اور مجال تعرض نہیں تھی۔ ہمارے افق پر اس قسم کی سیاہ اور خوفناک بدلیاں چھائی ہوئی تھیں ؛

جب اقبال کی ربانی شاعری اور آسمانی حکمت اس پرانے سومنات فکر کی تطہیر کا عزم لے کر اٹھی۔ اس نے اپنی حکیمانہ شاعری کی اصل عظیم کا پتہ نہایت واضح طور پر دے دیا ہے۔

من کہ این شب را چوں ماہ آراستم   گرد پائے ملت بیضا ستم

ہمنوا از جلوۂ اغیار گفت | داستان گیسو و رخسار گفت
من شہید تیغ ابروئے توام | خاکم و آسودہ کوئے توام

بکوئے دلبرے کارے ندارم | دلِ زارے غمِ یارے ندارم
بجبریلِ امین ہم داستانم | رقیب و قاصد و دربان ندانم
مرا با فقر سامان کلیم است | فرِ شاہنشہی زیر گلیم است

میرا نشیمن نہیں درگۂ میر و وزیر | میرا نشیمن بھی تو شاخ نشیمن بھی تو
تجھ سے گریباں مرا مطلع صبح النشور | تجھ سے مرے سینے میں آتش اللہ ھو
تجھ سے میری زندگی سوز و تب درد و داغ | تو ہی مری آرزو۔ تو ہی مری جستجو

شوق میری لے میں ہے شوق میری نے میں ہے | نغمۂ اللہ ھو میرے رگ و پے میں ہے

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا | فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

ہماری قومی زندگی کی تین بڑی شاخیں یعنی علم۔ فقر اور سیاست حیات ملی کے شجرۂ طیبہ سے کٹ کر بہار کی موہوم امید رکھ رہی ہیں۔ علماء۔ صوفیاء اور اہلِ سیاست دینی شاہراہ سے ہٹ کر اپنے اپنے تنگ دائروں میں محصور ہو کر انتشار اور تنگ نظری کے شکار ہو گئے ہیں۔ جب اپنے شجر سے پیوستہ تھے۔

تو اپنی بلندی اور وسعت میں زمین اور آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ جب کٹ گئے تو خشک اور بے نم ہو کر زرد پتوں اور خشک ریشوں کا ایک طومار نظر آنے لگ پڑے ؏

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی حکما بھی — خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک — ہر ایک ہے گو شرح معانی میں یگانہ
"بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رم آہو — باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ"!
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند — تاویل مسائل کو بناتے ہیں بہانہ!

اس بدحالی اور پریشان صورتی کی بنیادی علت اقبال کی عقابی نگاہ سے مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔ کیونکہ یہ ایک ایسے بامید مرد مومن کی نگاہ تھی۔ جس کی صداقت پر فَاِنَّہٗ یَنۡظُرُ بِنُوۡرِ اللّٰہِ۔ کی حدیث گواہ ہے۔ اس کی نظر اس نقطۂ نور تک پہنچی۔ جس کی صحیح تعلیم اور تربیت سے ہی انسان کی زندگی اور عروج وابستہ ہیں جس کی خوش تربیتی سے انسان ملائکہ سے بھی بڑھ جاتا ہے اور بدتربیتی سے چوپاؤں سے بھی نچلے درجے کو پہنچ جاتا ہے۔ وہ اس نقطۂ نور کو اکثر خودی کے نام سے پکارتا ہے۔ اور کبھی کبھی روح۔ دل۔ ضمیر۔ جان پاک وغیرہ وغیرہ ناموں سے بھی یاد کرتا ہے ؏

انسانی بدن بھی خودی کے احوال میں سے ایک حالت کا نام ہے۔ خودی درست ہے۔ تو بدن بھی درست ہے۔ خودی مقصود ہے۔ بدن مقصود نہیں ؏

قوموں کا اجتماعی نظام بھی ان کی خودی سے پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح ایک زندہ فرد کو اسکے بدن کے کاٹنے اور ایذا دینے سے تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک باغیرت قوم کو اس کی اجتماعی زندگی اور نظام کے مضروب کرنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ جس طرح ایک زندہ فرد کے لئے اپنی جان اور بدن کی

حفاظت ضروری ہے ۔ اسی طرح ایک باغیرت قوم کے لئے بھی اپنی اجتماعی زندگی اور نظام کی حفاظت ضروری ہے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اور نظام کا نام شریعت ہے ۔ اسی نے انکے لئے حلال و حرام، نیک و بد وغیرہ کا معیار قائم کیا ہے ۔ یہ نظام عظیم عدل اور رضا کے اصولوں پر تعمیر ہوا ہے اور اسکی جڑ حضور سرورِ کائنات کے ضمیر پاک کے اندر ہے ؎

آدمی اندر جہان خیر و شر | کم شناسد نفع خود را از ضرر
کس نداند زشت و خوب کار چیست | جادۂ ہموار و ناہموار چیست
شرع برخیزد ز اعماقِ حیات | روشن از نورش ظلام کائنات

گر جہاں داند حرامش را حلام | تا قیامت پختہ ماند ایں نظام
نیست ایں کار فقیہاں اے پسر | با نگاہے دیگرے ایں را نگر
حکمش از عدل است و تسلیم و رضاست | بیخ او اندر ضمیر مصطفیٰ است

جس طرح جان و بدن میں کوئی تنازع نہیں اسی طرح دین و سیاست اور فقر و سلطانی میں کوئی تصادم نہیں ؎

خسروی شمشیر و درویشی نگاہ | ہر دو گوہر از محیط لا الٰہ
فقر و شاہی واردات مصطفیٰ است | ایں تجلیہائے ذات مصطفیٰ است
ایں دو قوت از وجود مومن است | ایں قیام و آں سجود مومن است

اقبال کے نزدیک دین محض چند رسوم کا نام نہیں ۔ بلکہ ان رسوم سے اس دینی حرارت کو زندہ

رکھتا ہے۔ جو ایک مردِ مسلمان کو اپنے قومی نظام اور الٰہی شریعت کے ساتھ پیوستہ رکھتی ہے۔

در بدن داری اگر سوزِ حیات — ہست معراجِ مسلماں در صلوٰۃ
ور نداری خونِ گرم اندر بدن — سجدۂ تو نیست جز رسمِ کہن

اقبالؔ کے نزدیک دین اور اس کی تمام تجلیات کا سرچشمہ حضور سرورِ کائنات کا ضمیر ہے۔ غرضیکہ ملی زندگی کی تمام شاخیں امید بہار اسی صورت میں رکھ سکتی ہیں کہ اپنے شجر سے پیوستہ رہیں،

دینِ او آئینِ او تفسیرِ کُل — در جبینِ او خطِ تقدیرِ کُل
عقل را او صاحبِ اسرار کرد — عشق را او تیغِ جوہر دار کرد

حُریّت پروردۂ آغوشِ اوست — یعنی امروزِ امم از دوشِ اوست
او دلے در پیکرِ آدم نہاد — او نقاب از طلعتِ آدم کشاد
ہر خداوندِ کہن او را شکست — ہر کہن شاخ از نمِ او غنچہ بست
گرمیٔ ہنگامۂ بدر و حنین — حیدرؓ و صدیقؓ و فاروقؓ و حسینؓ
سطوتِ بانگِ صلوٰۃ اندر نبرد — قرأتِ الصّٰفّٰت اندر نبرد
تیغِ ایّوبی نگاہِ بایزید — گنجہائے ہر دو عالم را کلید
عقل و دل را مستی از یک جامِ مے — اختلاطِ ذکر و فکرِ روم و رے
علم و حکمت، شرع و دیں، نظمِ امور — اندرونِ سینہ دل ہا ناصبور
حسنِ عالم سوز الحمرا و تاج — آنکہ از قدوسیاں گیرد خراج

این ہمہ یک لحظہ از اوقاتِ اوست　　　یک تجلی از تجلیاتِ اوست
ظاہرش این جلوہ ہائے دلفروز　　　باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز
حمد بے حد مر رسولِ پاک را
آنکہ ایماں داد مشتِ خاک را

اقبال کے نزدیک انفرادی زندگی کا غالباً پہلا اصول یہ ہے۔ کہ انسان کسب حلال کرے۔ اور اپنی قوم کی گردن پر بوجھ نہ ہو۔

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب　　　وہ ناں جس سے جاتی رہے اسکی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند　　　رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

قوم کی اجتماعی زندگی کی صالحیت کا معیار یہ ہے۔

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس　　　نکتۂ شرعِ مبین این است و بس

ہمارا شرعی نظام اور ہمارے شرعی اعمال ہمیں ہم دل اور یک نگاہ بنا دیتے ہیں۔ چونکہ انکی بنیاد حریت عدل اور مساوات پر ہے۔ اسلئے ان کے غلبہ اور نصرت کے لئے جد و جہد کرنا دنیا میں حق کی حکومت قائم کرنے کے برابر ہے۔

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ　　　با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ
اہلِ حق را حجت و دعوے یکے است　　　خیمہ ہائے ما جدا دلہا یکے است
ذرہ ہا از یک نگاہی آفتاب　　　یک نگاہ شو تا شود حق بے حجاب

جاوید نامہ کے اندر فلک مشتری کی سیاحت کے دوران میں ایک موقعہ پر زندہ رود "حلاّج"
سے سوال کرتا ہے۔

چیست دیدارِ خدائے نہ سپہر　　آنکہ بے حکمش نہ گردد ماہ و مہر

حلاّج کا جواب ہے۔

نقشِ حق اوّل بجاں انداختن　　باز او را درجہاں انداختن
نقشِ جاں تا در جہاں گردد تمام　　مے شود دیدارِ حق دیدار عام

اے خنک مردے کہ از یک ہوئے او　　نہ فلک دارد طواف کوئے او
وائے درویشے کہ ہوئے آفرید　　باز لب بربست و دم در خود کشید
حکم حق را در جہاں جاری نکرد　　ناں از جو خورد و کراری نکرد
خانقاہے جُست و از خیبر رسید　　راہبی ورزید و سلطانی ندید

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے۔ جس طرح کہ اقبال کے نزدیک جان و بدن میں کوئی جھگڑا نہیں
اسی طرح دین و وطن میں بھی کوئی تنازعہ نہیں۔

ایں نکتہ کشایندۂ اسرارِ نہان است
ملک است تنِ خاکی و دیں روح روان است
تن زندہ و جاں زندہ ز ربطِ تن و جان است
با خرقہ و سجادہ و شمشیر و سناں خیز

ازخوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز

ازخوابِ گراں خیز

جان و بدن اور دین و وطن ایک ہی حقیقت کے دو مختلف نام ہیں۔ اقبال کو اگر عناد ہے تو محض وطنیت کے فرنگی تصوّر سے ہے۔ جس کی رو سے وطن دین پر مقدم ہو کر اساس ملّت بن جاتا ہے دین سے کٹ کر یہ تصوّر انسان کو حیوان بنا دیتا ہے۔ اس کے انصاف و عدل کے نظریات ایک جغرافیائی حدود کے اندر مقید ہو گئے ہیں۔ اور ان حدود سے جب وہ باہر نکلتا ہے۔ تو خدا کی باقی مخلوق کو وہ جانوروں سے بدتر سمجھنے لگ پڑتا ہے۔

دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی　　دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی　　ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

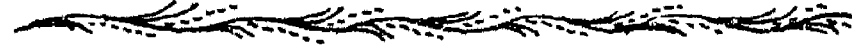
اسلام کی اساس توحید اور رسالت پر ہے۔ انسانی زندگی کی بنیادی ضروریات کی شرح کو وہ انسانوں میں سے ہی ایک انسان کامل کے سپرد کرتا ہے۔ جغرافیائی حدود اور رنگ و نسب کو انسانیت پر وہ مقدم نہیں سمجھتا۔

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے

ماحصل یہ ہے۔ کہ اقبال کی شاعری عرفِ عام کی سی شاعری نہیں۔ بلکہ یہ علمِ خودی ہے۔ جس میں ایک طرف جان و بدن اور دین و وطن کی نزاع کو دنیائے ذکر و فکر سے ختم کیا ہے۔ دوسری طرف ملتِ اسلامیہ کو ان کی اساس ملت کے ساتھ گرویدگی سکھا دی ہے۔ دنیاوی زندگی کو "روزِ میداں"

کہا ہے۔ اور اسلام کے بادشاہِ اوّل و آخر کے احکام کا احترام سکھایا ہے۔

حکمِ سلطان گیر و از بخشش منال
روزِ میداں نیست روزِ قیل و قال
تختِ جم پوشیدہ زیرِ بوریا است
فقر و شاہی از مقاماتِ رضا است





اقبال اور فنونِ لطیفہ

از

پروفیسر عابد علی عابد ــــــ ایم اے

انسان بھی ایک عجب عالم طلسمات ہے، فکر کے رنگ گوناگوں، بات کے ڈھنگ بوقلموں، کبھی دل پر بنی ہوئی کبھی دل سے ٹھنی ہوئی، خود ہی جال بچھاتا ہے خود ہی شکار ہو جاتا ہے اڑان کی رو میں ہو تو آسمان پاؤں کے نیچے، نشیب کی طرف مائل ہو تو زمین بھی آسمان ؛

دوسرے حیوانات سے جدا کرنے کے لئے اس کی مختلف پہچانیں بتائی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ بات کر سکتا ہے، مل جل کر رہنے کا عادی ہے، ہنستا ہے، ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے، لیکن کسی روشن دماغ نے کیا خوب بات پیدا کی ہے۔ کہ انسان کی بڑی پہچان یہ ہے۔ کہ بعض کام بغیر ضرورت کے کرتا ہے ؛

حق یہ ہے۔ کہ بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ہم آپ روزانہ ضرورت کے مطابق باتیں کرتے ہیں۔ اپنا مطلب دوسرے کو سمجھاتے ہیں اس کا سمجھتے ہیں، تو زندگی کا کاروبار چلتا ہے لیکن ضروری باتوں کے علاوہ انسان بات میں سے بات بھی نکالتا ہے، بات کرنے کی خاطر بات کرتا ہے کسی مہذب جلسے میں ذرا تکلف کے ساتھ اونچ نیچ کا خیال رکھ کے یونہی اِدھر اُدھر کی ہانکتا ہے، تو اسے

گفتگو سازی (making conversation) اور "یارانِ سرپل" کی محفل میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے تو اسے گپ بازی کہتے ہیں۔ پھر گفتگو سازی اور گپ بازی کی ترکیب سے ایک نئی چیز پیدا کرتا ہے۔ جس میں گپ بازی کی بے تکلفی اور برجستگی اور گفتگو سازی کی تہذیب و متانت ہوتی ہے اسے فنِ گفتگو کہتا ہے۔ اور اس فن کے ماہروں کو کبھی ظریف اور گفتگو باز کا لقب دے کر خوش ہوتا ہے مزے کی بات یہ ہے۔ کہ اس بیکار اور بے ضرورت چیز کو پُر لطف اور بامزہ خیال کرتا ہے۔ یہی حالت آواز کے اتار چڑھاؤ اور لفظ کے الٹ پھیر کی ہے۔ روزانہ ضرورت سے کبھی چیخ کر کبھی پکار کے کبھی نرم لہجے میں کبھی و اجبی آواز میں کام چلاتا ہے لیکن کبھی کبھی انہیں آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے، ان کو ایک خاص طور پر ملا کر، جوڑ توڑ کر خاص قسم کی رسیلی اور سریلی آوازیں پیدا کرتا ہے۔ بالکل بے ضرورت، انہیں موسیقی کہتا ہے، بے معنی الفاظ کی ایک متناسب تکرار کا نام سرگم رکھتا ہے۔ پھر بولوں کو تال میں بانٹتا ہے، اور اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دیتا ہے۔ کہ ہاں بیکار لیکن کیسی طرحدار، کیسی سریلی اور کیسی میٹھی آوازیں ہیں +

روز نثر بولتا ہے اور لکھتا ہے۔ پھر لفظوں کو ایک خاص طرح ترکیب دیتا ہے اور کہتا ہے یہ شعر ہے۔ بے ضرورت لیکن کیسا لوچدار اور خوبصورت،

یہی حال رنگ اور خطوط کا ہے، خطوط سے مستطیل مربّع اور مثلث الاضلاع بناتا ہے۔ اور ان کی بنا پر دنیا کی بڑی بڑی عمارتوں کی طرح ڈالتا ہے لیکن کبھی کبھی بے ضرورت خطوط کے پیچ و خم رنگوں کی ملاوٹ، دھوپ سائے کے جوڑ سے کیسی کیسی موہنی مورتیں اور دل لبھانے والی صورتیں بناتا ہے کہ خود گھنٹوں دیکھا کرے

یہی انسان کا آرٹ ہے۔ بیکار لیکن طرحدار! بے ضرورت لیکن خوبصورت !!

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں آرٹ کی ایک معیاری خصوصیت پر زیادہ زور دیا گیا ہے یعنی حسن، روپ، ورنہ آرٹ کی اور بہت سی تعریفیں بھی ہیں مثلاً یہ کہ ظاہر کے ذریعے "باطن" کے اظہار کا نام آرٹ ہے۔ یا یہ کہ آرٹ خدا کی شبیہ ہے لیکن مغرب میں آرٹ کا جو تصور ہے۔ اس میں زیادہ اہمیت حسن وجمال کے اظہار ہی کو دی جاتی ہے، اور یہی وجہ ہے۔ کہ میں نے ابتدائی حصے میں اس پہلو کو نمایاں کر کے دکھایا ہے،

آرٹ کے سلسلے میں مغرب نے حسن کے متعلق جو موشگافیاں کی ہیں۔ ان سے الجھنے کی اس مضمون میں ضرورت نہیں لیکن اقبال کے تصور کو زیادہ واضح کرنے کے لئے اس بحث کی چند گرہیں کھولتا ہوں۔ یوں تو حسن کی وجہ سے دنیا میں ہمیشہ ہنگامہ بپا رہا ہے لیکن آرٹ کی فضا میں اس لفظ کے غلط استعمال نے جو فساد پیدا کیا ہے۔ اس کا ٹھکانا نہیں۔ حسن ایسا غیر مبہم اور رطب اللسان لفظ ہے کہ اکثر اوقات اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ حسن کو جمالیاتی معنوں میں نہیں برتتے۔ بلکہ اس لفظ کو اس کے معمولی معنوں میں استعمال کر جاتے ہیں، عوام کا تو کیا ذکر ہے!

جب کوئی عام آدمی حسین عورت کی ترکیب استعمال کرتا ہے تو اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا۔ کہ اس کو دیکھ کر ان جذبات میں تحریک ہوتی ہے۔ جو حسین وجمیل چیزوں کی قدردانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ یہ عورت چاہے جانے اور حاصل کرنے کے قابل ہے۔ مسٹر کلائیو بیل[1] نے کیا خوب کہا ہے۔ کہ انسان کے متعلق جب حسین کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اکثر اوقات کہنے والے اور سننے والے کا ذہن فوراً حسن کے جنسی پہلوؤں کی طرف متوجہ ہوتا ہے،

---

1. Art. By Clive Bell.

اکثر ادب اور آرٹ کے خود ساختہ نقاد وہ بر خود غلط اور بدذوق بزرگوار ہوتے ہیں جو ایک حسین عورت کو دنیا کی سب سے جمیل چیز اور اس کی تصویر کو مصوری کا منتہائے کمال تصور کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی گود میں تربیت پائے ہوئے دماغ مشرق کے ہوں یا مغرب کے جمالیاتی حسن سے بالکل بے بہرہ اور ذوق سلیم سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ ان کی نظر میں حسین آرٹ وہ ہے۔ جو کسی نہ کسی شکل میں عورت سے متعلق ہے ؂

ان حضرات کو ان گیت میں روپ نظر آتا ہے جس کے الفاظ بیتی ہوئی سہاونی راتوں کی یاد تازہ کریں ؎

یار کی بزم ناز میں گذری ہوئی جوانیاں

کی مقبولیت کا یہی راز ہے۔ سننے والے گیت سنتے ہیں اور اپنی ماضی کی رسیلی یاد سے متاثر ہوتے ہیں بلکہ یہاں تک کہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اصل چیز گانا تھا، گانے کے الفاظ نہیں تھے۔ یہ قدر دانی موسیقی کے حسن کی قدر دانی نہیں۔ اپنی جوانی کی بقایا ہوس کاری کی قدر دانی ہے ؂

ان لوگوں کو ٹھمری وہی پسند آئے گی جس کو سن کر آج سے کچھ سال پہلے کسی گانے والی کی موہنی صورت آنکھوں کے سامنے آجائے اور پاؤں کے گھنگھروں کی جھنکار کان میں گونجنے لگے ؂

یہی حالت شعر کی قدر دانی کی ہے، ان لوگوں کی نظر میں شعر وہ ہے۔ کہ اسے سن کر آج سے بیس سال پہلے وہ شعلہ جو کسی "بنت عم" کو دیکھ کر روشن ہوا تھا۔ اس کی خاکستر میں پھر ایک چنگاری جاندار معلوم ہونے لگے اور دل انہی جذبات سے کھیلنے لگے۔ جو جوانی کی شوریدہ سری سے مخصوص ہیں ؂

یہی وجہ ہے کہ زوال پذیر قوموں کے شعرا اپنی تہی دامنی کو حسن کے پردے ہیں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں جسن کی جمالیاتی تفسیر سننے کے بغیر اس کے صحیح استعمال سے ناواقف ہونے کے باوجود وہ اپنی ہرزہ سرائی مختصراً "عورت پرستی" کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔ گویا ان کا آرٹ تخلیق حسن کا فرض انجام دے رہا ہے۔ یہ بدنصیب نہیں جانتے کہ جس کو وہ حسن کہتے ہیں وہ دراصل جزو ہے اس تصور کا جو عورت کے جنسی حسن کے متعلق ان کے ذہن ہیں پہلے سے موجود ہے اور جسے جمالیات سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ کور ذوق نہیں جانتے کہ عورت کے حسن کا جنسی تصور ان کے لئے ایک ذہنی پیمانہ ہو چکا ہے اور اسی پیمانے سے وہ ہر چیز کے حسن کو ناپتے ہیں ؛

یہ نہایت شدید ذہنی مرض ہے جس کی جڑیں ہندوستان کے شاعروں مصوّروں اور مطربوں کے دلوں کے عمیق ترین گوشوں ہیں پہنچ چکی ہے۔ ہماری ادبیات میں زندگی کے بالاتر احساس سے بے پروائی ، اور حسن کا جنسی تصور خاص طور پر نمایاں ہے۔ غنائی شاعری کو چھوڑیئے اس میں تو اس قسم کی حسن پرستی کے سوا اور کچھ نظر ہی نہ آئے گا۔ جس کو ہم وطنی اور انقلابی اور "منظر نگار" شاعری کہتے ہیں وہاں بھی حسن اور روپ عورت کی نسبت اور اسکے واسطے سے پیدا کئے جاتے ہیں ؛

یہ فطرت کے جھوٹے منظر نگار ، یہ انقلاب کے غیر مخلص پرچارک ، یہ وطنیت کے بے علم علم بردار نہ کسی چیز میں حسن دیکھ سکتے ہیں۔ نہ اپنی باطنی قوتوں کے ذریعے حسن کا اظہار کر سکتے ہیں یہ اندھے عورت کے جسمی حسن کی مشعل لے کر چلتے ہیں اور اسی مشعل سے اپنی تاریک اور زوال پذیر شاعری کو روشن کرنا چاہتے ہیں ، یہی وجہ ہے۔ کہ جب ان کی نظم میں عورت مرکزی وجود نہیں ہوتی تو گھبراتے ہیں۔ کہ حسن کس طرح پیدا ہوگا ، اور مجبوراً جب تک نظم کے جسم میں کسی حسین عورت کا پیکر داخل نہ کر سکیں انکی بے راہ روی

تسکین نہیں پاتی ۔

اس قسم کے یاوہ گوؤں میں اس ذہنی فالج اور اس جنسی غلامی کی گمراہ ترین شکل جوشؔ ملیح آبادی کا کلام ہے۔ اس کی ایک نظم ہے "کوہستان دکن کی عورتیں"۔ یہ نظم جوشؔ کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک عجیب چیز ہے۔ کوہستان کا زندگی افزا منظر ہے چلچلاتی دھوپ میں وہاں کی سیہ فام عورتیں سنگ اسود کی چٹانیں بن کر کھڑی ہیں، لیکن زندگی اور صحت مندی کی اس توانا فضا میں جوشؔ نے عورت کی جو تصویر دیکھی ہے، اس میں بھی عورت کو جسمی طور پر چاہے جانے کے قابل بنانا چاہا ہے

چال جیسے تند چشمے تیوریاں جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں بے مثال

یہ تصویر کھینچ کر "شاعر انقلاب" اس سیہ فام حسن سے پڑھنے والوں کا تعارف کرا کر رخصت ہوتا ہے

اس طرف لاش کسی کشتۂ غم کی اٹھی
اس طرف سوگ نشیں سوگ منا کے اٹھے

اس شاعر کی نماز یوں ہوتی ہے۔ کہ ایک بدصورت لیکن جوان عورت سے لگاوٹ کے طریقے پر اظہار عشق کرتا ہے !

جوانی کا امنگ بھرا زمانہ وہ ہے۔ جس میں قوت عمل پورے جوش میں ہوتی ہے جب انسان پتھروں سے دودھ کے دریا بہا سکتا ہے۔ دوزخ کو جنت بنا سکتا ہے۔ قوت باطنی کے اظہار سے ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے۔ اس زمانے کی تصویر ہمارے "شاعر انقلاب" نے اپنی نظموں میں اور ہمارے "خیام العصر" نے اپنی رباعیوں میں ایسے انداز سے کھینچی ہے۔ کہ سوا

ادنےٰ درجے کے جلبسی محرکات کے کچھ نظر نہیں آتا۔

نتیجہ ان باتوں کا یہ نکلا ہے۔ کہ ہماری ادبیات میں اگر کہیں خلوص ہے۔ تو وہ غنائی شاعری میں ہے۔ وارداتِ قلب کے اظہار میں ہے۔ عیش کوشی کی تفسیر میں ہے۔ تیاگ کے بیان میں ہے۔ اس سے پرے جب ہمارے شاعر خدا کی کائنات میں داخل ہوتے ہیں زندگی کے مسئلوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ تو سوز و فکر سے بالکل عاری ہو جاتے ہیں۔ یا تو نفس کی کیفیات کا جائزہ لیتے رہتے ہیں، اور اپنے آپ میں گم رہتے ہیں۔ داخلی حدود سے کبھی باہر نہیں نکلتے اپنے حال میں مست، اپنی زندگی کے حالات سے بے پرواہ، اپنے آپ میں مگن، دوسروں کی کیفیات سے بے نیاز، یہی ان کی کائنات، یہی ان کی شاعری کا میدان، ان کا دل، ان کا جام جہاں نما، ان کا شعر ان کا ساغرِ حیات ہوتا ہے۔ اور کبھی اس خاکستر کے ڈھیر کو سست ہاتھوں سے ہٹا کر ذرا سر بلند کرتے ہیں اور سوچنا چاہتے ہیں۔ تو دوسروں کی دماغی کاوشوں سے سوچتے ہیں، کوئی اور ان کے لئے سوچتا ہے۔ وہ اس کی سوچ کو جانچنے کے بغیر اس کے ہم نوا ہو جاتے ہیں اور خود فریبی کی پرانی عادت سے مجبور یہ سمجھتے ہیں۔ کہ ہم خود سوچتے ہیں اور سوچ رہے ہیں۔ دوسروں کے دماغ سے سوچنے کا نام انہوں نے وطن پرستی رکھا، ان لوگوں کی وطنی اور انقلابی شاعری سوز و فکر سے بیگانہ خلوص سے عاری اس سے کہیں بدتر ہے۔ کہ کہ تھیئٹر میں کسی ہیجڑے کو ایک جوانمرد کے روپ میں پیش کیا جائے۔ اس سلسلے میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے، کہ جوش کے دامن فکر میں سوائے چند خوب صورت ترکیبوں کے اور کچھ نہیں ہے اس کے انقلاب کے دعوے باطل۔ اس کے بغاوت کے داؤ مہمل۔ رگیں پھلانے سے

منہ میں جھاگ لانے سے، مٹھیاں بھینچنے سے، تیوریاں چڑھانے سے، ہوا کے گھوڑے پر چڑھ کر ہوا سے لڑنے سے، مذہب کے شاعر کو بدنام کرنے سے، انقلاب پیدا نہیں ہوا کرتا۔ انقلاب کی جد و جہد میں جو سخت کوششوں کے مرحلے آتے ہیں۔ ان کو طے کرنے کے لئے صرف لفظوں کا طمطراق اور جلالِ باد و باراں کا مذاق اڑانا کافی نہیں ہے۔ یہ خوبصورت لفظ ٹین کے ہتھیاروں سے سجے ہوئے کرائے کے سوار ہیں۔ ان سے اوج انسانی میں کوئی انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خود شاعر کا باطن اس انقلاب کی روح، اور اس کے حسن سے بالکل بے خبر اور بے پرواہ ہے ؂

اس ذہنی مرض سے اقبال نہایت خائف ہے۔ اس نے حسن کے نقاب کے نیچے ہمارے شاعروں اور سطریوں اور مصوروں کی عورت پرستی کو صاف دیکھا ہے۔ اور اس مرض کا علاج یہ سوچا ہے۔ کہ ان کو صاف الفاظ میں تنبیہ کی جائے، کہ جسے یہ صنعت کا حسن سمجھتے ہیں وہ عورت کے حسن کا جسمی اور جنسی تصور ہے جو کسی نہ کسی روپ میں ان کی مخلوقات ہنر میں ظاہر ہوتا رہتا ہے جب یہ لوگ اس سے پرے ہٹتے ہیں، تو گویا سوانگ رچاتے ہیں۔ اور اندھے نقال ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان سے یہ امید رکھنا کہ اپنے باطن میں کسی تخلیقی قوت کی نمو کا احساس کریں گے - بالکل بے کار ہے۔ اقبال کی نظر میں یہ لوگ ؂

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند ‏ ‏ ‏ کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس ‏ ‏ ‏ آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

آرٹ کے سلسلے میں اقبال کو حسن کے لفظ کے استعمال سے جو ضد ہے۔ اس کی ایک وجہ

اور بھی ہے۔ جس چیز کو جمالیات میں حُسن کہتے ہیں۔ وہ اصلاً شکل سے، پیکر سے، انداز سے، ظاہر سے تعلق رکھتی ہے۔ روح سے، معانی سے، مغز سے، موضوع سے اسے کوئی واسطہ نہیں، آرٹ کی تمام مخلوقات حسن کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ حافظ کا ایک شعر، شیکسپیئر کا ایک ڈرامہ، انجلو کا ایک مجسمہ، حسن کی نوعیت میں بالکل یکساں ہے۔ آرٹ میں حسن کے مدارج نہیں ہیں۔ آرٹ کی مخلوق یا حسین ہے، یا حسین نہیں ہے۔ یہ سوال کہ آیا کسی کا آرٹ اعلےٰ درجے کا ہے، یا ادنےٰ درجے کا شکل یا حسن کی نسبت سے طے نہیں ہوتا۔ بلکہ موضوع اور معانی کے ذریعے طے ہوتا ہے۔ یعنی حسن شکل سے وابستہ ہے عظمت اور پستی معانی و مطالب سے ؂

مسٹر الیگزنڈر نے اپنی تصنیف "حسن اور قیمت جانچنے کے دوسرے پیمانے" میں اس مسئلے کو بہت سلجھا کر لکھا ہے لیکن مشرق کا ایک سپوت شیخ آذری ان سے بہت پہلے آرٹ میں حسن اور عظمت کی بحث کا فیصلہ کر چکا ہے ؂

اگرچہ شاعراں در بزم اشعار — زیک جام اندو در بزم سخن مست
و لے با بادۂ بعضے حریفاں — فریب چشم ساقی نیز پیوست
زبان طوطیٔ گفتار ایشاں — زباں از نکتۂ صورت فرو بست
کمند فطرت ایشاں گہ تطم — بدریائے حقیقت افگند شست
بسے فرق است ازیں تا آں کہ تطمے — کسے با صد حیل بر یک دگر بست
مبین یکساں کہ در اشعار ایں قوم — ورائے شاعری چیزے دگر ہست

موضوع و مطالب سے آرٹ کی عظمت کا جو تعلق ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے سب سے پہلے عاشقانہ شعر

کہنے کے لئے کارگری کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک پیمانہ فکری یعنی غزل (ردیف اور قافیے کی پابندیوں کے ساتھ) موجود ہے، روایات تغزل موجود ہیں، ایک پامال راستہ موجود ہے۔ سانچے میں ڈھلی ہوئی ترکیبیں۔ پرانے استعارے اور کنائے موجود ہیں۔ ذرا سی محنت سے "مطلب" ایک حسین شکل اختیار کر سکتا ہے۔ اس کے برخلاف ایک فلسفیانہ نظام کو پیش کرنے کے لئے اس قسم کی کوئی آسانی نہیں ہے نئی بات کہنے کے لئے الفاظ کا سینہ چیر کر ان کو نئی اہمیت بخشنی پڑے گی۔ اظہار کے لئے پیکر خود تراشنا پڑے گا۔ اس ذہنی ہنگامہ آرائی کے بعد معانی ایک خاص شکل اختیار کریں گے۔ معانی کے دُرِ نایاب کو رشتۂ الفاظ میں پرونا ہو۔ تو صنعت گر کی مشاق انگلیوں میں لرزش نہیں ہونی چاہیئے۔ آنکھیں عقاب کی طرح تیز، صبر سمندر کی طرح بے کراں اور حوصلہ ثریّا کی طرح بلند ہونا چاہیئے ورنہ شکل اور پیکر ایک دوسرے سے کبھی ہم آہنگ نہ ہو سکیں گے، کہ صناع کا مقصد بوجہ احسن پورا ہو جائے۔ اس سلسلے میں صنعت گر کو جو مشکلات پیش آتی ہیں، ان کی طرف مختلف اُردو شاعروں نے اپنے اپنے انداز میں اشارہ کیا ہے ؎

خشک سیروں تنِ شاعر میں لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

شاعری بھی کام ہے آتش مرصّع ساز کا

دُرِ نایابِ معانی نے کیا مجھ سے گریز   جب اسے تارِ تخیل میں پرونا چاہا

اقبالؔ نے لفظ و معنی کے اُلجھے ہوئے رشتے کی گرہ یوں کھولی ہے ؎

اختلاطِ لفظ و معنی ارتباطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

دراصل آرٹ کے سلسلے میں حُسن کو ہمیشہ سامنے رکھنے سے صرف شکل و پیکر کی اہمیت سامنے رہتی ہے۔ موضوع و معانی کی بلندی، مطالب کا اچھوتا پن، فکر کی توانائی اور صحت مندی اکثر اوقات فراموش کر دی جاتی ہے۔ جو قومیں زوال و انحطاط کے خطرناک عوامل سے دوچار ہوتی ہیں۔ ان کے قومی، معاشرتی اور سیاسی انتشار کا ایک عکس آرٹ میں بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ مغز اور معانی کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں، پیکر کی رعنائیوں کی طرف ٹکٹکی بندھ جاتی ہے۔ مٹی کے پھلوں کے رنگ اور شکل کو دیکھ کر رس کا تصوّر کیا جاتا ہے۔ سریلی آوازوں کے مجموعے کا نام موسیقی، خوبصورت شکلوں کے عکس کا نام مصوّری اور مرصع الفاظ کی باوزن ترکیب کا نام شاعری رکھا جاتا ہے۔

غدر سے پہلے کی اُردو شاعری کو (دہلوی ہو یا لکھنوی) چند مستثنیات سے قطع نظر صرف پیکر پرستی کا لقب دیا جا سکتا ہے۔ لکھنوی دربار کی گود میں پلے ہوئے شاعروں کی یاوہ سرائیاں تو سراسر مہمل ہیں۔ ان شاعروں کا محبوب مشغلہ صرف آرٹ کے مسالہ سے کھیلنا، مختلف رنگوں کو ملا کر بغیر کسی معنی کی نسبت کے ایک ایسا اثر پیدا کرنا جو آنکھوں کو بھلا معلوم ہو، ان لوگوں کا منتہائے نظر ہے۔ ان کے لئے لفظ خود ہی مقصد، خود ہی حصولِ مقصد کا وسیلہ ہیں ؎

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گِلِ کوزہ

اس زمانے کے کسی بزرگوار کا شعر ہے ؎

بارہ دری میں بیٹھے ہیں دشمن کے پاس وہ
معلوم ہو گیا مجھے ششدر بنائیں گے

ایک اور بزرگوار فرماتے ہیں ؎

زلف لٹکا کے وہ جس دم سرِ بازار چلا
ہر طرف شور اُٹھا مار چلا مار چلا

ایک حضرت کا ارشاد ہے ؎

عناب لب، لعابِ دہن، شربتِ وصال
نسخہ یہ چاہیئے تیرے بیمار کے لئے

اور امانت لکھنوی کی مصحفِ کمال کی مشہور آیت ہے ؎

بیر بہوٹیے ملتے ہیں آنکھیں تیری گرگابی پر

یہ نتیجہ ہوتا ہے آرٹ میں حسن پر زور دینے کا!

اقبال ہمیں آرٹ کی شکل آرٹ کے حسن سے ہٹا کر آرٹ کے معانی، موضوع اور مطالب کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ ابھی یہ مرحلہ نہیں آیا کہ بتایا جائے اقبال کی نظر میں آرٹ کا کیا مقصد ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہونگا کہ اقبال کی نظر میں آرٹ کی عظمت اور حسن کا تعلق اصلاً معانی و مطالب اور آرٹسٹ کی شخصیت سے ہے اس کا خیال ہے۔ کہ فطرت کے خام مسالہ میں حسن موجود نہیں ہے۔ اعلےٰ درجے کا آرٹسٹ اپنی باطنی دنیا کو ایک مادی شکل دینے کے لئے فطرت کے مسالہ کو ایک قہرماں کی طرح بجبر و قہر استعمال میں لاتا ہے خود فطرت بلکہ کار بلکہ حقیقت کے چہرے پر ایک نقاب ہے۔ آرٹسٹ کی رفتار گرم میں حائل ہوتی ہے سنگ و خشت

خطوط و رنگ اور الفاظ عالم باطن کے کوائف کے اظہار کا وسیلہ ہیں۔ صناع فطرت کو اپنے قالب میں ڈھالتا ہے۔ خود اس کے قالب میں کبھی نہیں ڈھلتا۔ "شکل" کا حسن بھی اقبال کی نظر میں آرٹسٹ کی شخصیت اور معانی کا حسن ہے۔ اس خیال کا اظہار اقبال نے کئی جگہ کیا ہے ؎

آیا کہاں سے نغمۂ نے میں سرورِ مے — اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے؟

جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا! — سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

مردِ بزرگ کے متعلق کہتا ہے ؎

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں — بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا — اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

آرٹ میں "پیکر اور مغز" "مطالب اور شکل" کے متعلق عبدالرحمٰن بجنوری نے مائیکل آنجلو کا ایک قول نقل کیا ہے:-

"مجسمہ ساز بُت کو مرمر تراش کر نہیں بناتا۔ بلکہ بُت ابتدا ہی میں سنگِ سفید میں موجود ہوتا ہے اور جلوہ نمائی منتظر اور متقاضی، استادِ کامل محض پتھر کی عارضی چادر کو علیحدہ کر دیتا ہے"

اگر یہ قول واقعی مائیکل آنجلو کا ہے۔ تو اس کے ذہنِ رسا پر ایمان لانا پڑتا ہے:

سبحان اللہ! مخلوقاتِ ہنر اور اتنی ارزاں! اس کا مطلب تو یہ ہوا، کہ آرٹسٹ مجبور ہے۔ کہ اپنے عملِ تخلیق کے ذریعے صرف اس حسن کو بے نقاب کرے جو فطرت میں پہلے سے موجود ہے۔ یعنی اپنی باطنی دنیا کی تمام قوتوں کو صرف اس حد تک کام میں لائے۔ کہ فطرت کی قیود میں اسیر رہ کر فطرت کے

قالب میں ڈھل کر جو ہے" اسے دریافت کرتا ہے ؎

اقبال کا نظریہ یہ ہے۔ کہ صناع کائنات کی ہر چیز پر حکمران ہو کر فطرت کے وسیلوں پر غالب آکر خام مسالے کو وہ شکل دیتا ہے جو پہلے اس کے باطنی وجود میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کی نظر میں پتھر بیجان، مردہ۔ بے حس اور بے کار ہے۔ آرٹسٹ اس کا سینہ چیر کر اس میں اس بُت کی تصویر داخل کرتا ہے۔ جو باطنی دنیا میں پیدا ہوتی ہے۔ خود اقبال مقدمہ دیوان چغتائی میں کہتا ہے "۔ اس بات کی اجازت دینا۔ کہ مرئی غیر مرئی کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دے۔ فطرت سے ہم آہنگ ہونا گویا اس بات کا اعتراف ہے۔ کہ فطرت انسان کی روح پر غالب آگئی۔ قاہری اس میں ہے۔ کہ فطرت کے محرکات کا مقابلہ کیا جائے۔ نہ یہ کہ ان محرکات کے اعمال کے آگے سر تسلیم خم کر دیا جائے۔ جو "ہے" اس کا مقابلہ تاکہ۔ جو "ہونا چاہیئے" پیدا ہو سکے، یہی زندگی اور توانائی ہے۔ باقی ہر چیز انحطاط اور موت ہے۔ خدا اور انسان تخلیق پیہم سے زندہ رہتے ہیں ؎

حسن را از خود بروں جستن خطاست
آنچہ می بائست پیش ما کجاست

وہ صناع جو نوع انسانی کے لئے ایک نعمت ہے۔ گویا خدا کا ہم باز ہے۔ فطرت صرف "ہے" اور اس کا کام صرف یہ ہے۔ کہ جو "ہونا چاہیئے" اس کی جستجو میں حائل ہو۔ صناع کو اپنے وجود کی گہرائیوں میں اس دنیائے نو کی تلاش کرنی پڑے گی، جو موجود نہیں ہے۔ لیکن جسے موجود ہونا چاہیئے۔"

زبور عجم میں کہتا ہے ؎

جہانِ رنگ و بو گلدستۂ ما ز ما آزاد و ہم پابستۂ ما

خودی اُورا بہ یک تارِ نگہ بست — زمین و آسمان و مہر و مہ بست

حدیثِ ناظر و منظور رازیست — دلِ ہر ذرہ در عرضِ نیازیست

نوائے شاہدِ مرا شہود گرداں — ز فیضِ یک نظر موجود گرداں

سخن از بود و نابود جہاں با من چہ مے گوئی

من این دانم کہ من ہستم ندانم ایں چہ نیرنگ است

غزل آں گو کہ فطرت سازِ خود را پردہ گرداند

چہ آید زاں غزل خوانے کہ با فطرت ہم آہنگ است

یہی وجہ ہے۔ کہ اقبال اس خیال کا بار بار اظہار کرتا ہے۔ کہ اچھے آرٹ کی شکل میں حُسن ہو یا نہ ہو، صفائی، سادگی، روانی اور قطعیت ضرور ہونی چاہیئے۔ کیونکہ زبان و انداز کا مبہم ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ کہ صرف شکل کی اہمیت پر زور دیا جا رہا ہے جسے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ وہ پہلے یہ سوچتا ہے۔ کہ آیا مفہوم نہایت صاف طریق پر واضح ہو گیا یا نہیں، الفاظ کی صنعت گری اور آرائش ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ جو آرٹسٹ اس صنعت گری کے طلسم میں گرفتار ہو گیا۔ وہ گویا یہ بھول گیا، کہ آرٹ میں اصل چیز مغز و روح ہیں"۔ مومن کی شاعری اس ژولیدہ گفتاری کی بہترین مثال ہے جو انحطاط کے دَور میں گذرنے والی قوموں کی سب سے بڑی پہچان ہوتی ہے"[1]

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اقبال جمالیاتی حسن یعنی آرٹ کی

[1] خود علامہ مرحوم کے الفاظ ہیں۔

شکل سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ ایسا نہیں ہے۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے۔ کہ حسن یعنی شکل کی نسبت آرٹ سے وہی رہے۔ جو اظہارِ مطالب اور تخلیق معانی کے لئے ضروری ہے۔ اس سے پرے جانا حقیقت سے گریز اور اصل موضوع سے جدائی ہے ٭

آرٹ میں کوشش و کاوش کے بغیر فطرت کے خام مسالے کو کبھی اپنے مطالب کے مطابق تراش کر اور ڈھال کر استعمال نہیں کیا جاسکتا، آرٹ کے وسائل آرٹسٹ کے ہاتھ پاؤں ہیں۔ ان کو مفلوج کر کے وہ ایک قدم آگے نہیں چل سکتا۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ ہاتھ پاؤں میں مہندی لگا رکھی جائے اور اصل مقصد کے حصول کو ناممکن بنا دیا جائے۔ وحشت کلکتوی کہتا ہے ؎

فروغ طبع خداداد اگرچہ تھا وحشت
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسبِ فن کے لئے

اقبال نے اس خیال کو نہائت سلجھا کر یوں کہا ہے ؎

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خداداد — کوشش سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر — میخانۂ حافظ ہو کہ بُت خانۂ بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا — روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

یہاں یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ اقبال خود آرٹ کی شکل کو ثانوی حیثیت دیتا ہے[1] لیکن اس بنا پر یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے، کہ خود اقبال کا آرٹ اپنی شکل میں حسن نہیں رکھتا۔ مثلاً اس کی نظم

[1] نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر ہیں ٭ کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی ٭

"میں اور تو" اعلےٰ درجے کی فن کاری پر دلالت کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل شعر بھی دیکھئے ؎

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن | مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن
حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کیلئے | ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؛
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں | تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

دراصل اقبال کے خیال میں فن کاری کے نازک پودے خونِ جگر سے سینچے جاتے ہیں۔ اور ان کے رنگ و بو کا حسن دراصل صناع کی شخصیت کا حسن ہوتا ہے۔ مسجدِ قرطبہ میں یہ خیال نہایت سلجھا کر ظاہر کیا گیا ہے ؎

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل!
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

آرٹ میں روح و پیکر اور الفاظ و معانی کی بحث کا ایسا ناطق فیصلہ شاید ہی کسی صناع نے کیا ہو۔ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کا ماحصل ان ہی دو شعروں کو سمجھنا چاہیئے ؛

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آرٹ کا مقصد کیا ہے۔ آرٹ کو کیا ہونا چاہیئے اور کیا کرنا چاہیئے۔ اقبال کا دماغ پامال راستوں سے ہٹ کر سوچتا ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے۔ کہ اقبال کی نظر میں آرٹ کا مقصد ہے۔ خودی کی تکمیل۔ جو آرٹ اس مقصد کے حصول میں مدد دیتا ہے۔ وہ توانا صحت مند اور عالی رتبہ ہے۔ جو اس راہ میں حارج ہوتا ہے وہ زوال پذیر و مہلک ہے ؛

اقبال کی نظر میں ماحول کے خلاف بغاوت کرنا۔ اسے اپنے سانچے میں ڈھالنا۔ رکاوٹوں کو اپنے وجودِ معنوی میں جذب کر کے آگے بڑھنا۔ نت نئی آرزوں، نت نئے معیاروں کو سامنے رکھنا زندگی ہے اور جس کی زندگی اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ اس کی خودی بیدار ہے۔ اس کے سوا ہر چیز موت ہے۔ فسانہ و فسوں ہے ۔

زندگی کے اس معیار کے حصول میں جو آرٹ مدد دے وہی مشعل راہ ہے۔ جو زندگی کی حقیقتوں سے گریز کرنا سکھائے وہ امتوں کی رسوائی کا سامان ہے۔ اس بحث کو جانے دیجئے کہ آرٹ کا یہ تصور جمالیات کے خود ساختہ اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں۔ ذرا یہ سوچئے کہ مٹی ہوئی قوموں کے لئے جن کے تمام قوائے معنوی مفلوج ہو چکے ہیں۔ جن کا ملی اور سیاسی شیرازہ بکھر چکا ہے۔ جن کی نیند موت سے مشابہ ہے۔ خیام کی رباعیاں زیادہ موزوں ہیں یا اقبال کے حیات آفریں نغمے ۔

خود اقبال نے کہا ہے کہ ایک زوال پذیر شاعر کا ایک شعر قوموں کے لئے چنگیز خاں کی غارت گری سے زیادہ مہلک ہو سکتا ہے۔ یہ تماشا پچھلے دنوں میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ایک مقامی مشاعرے میں جہاں ہندوستان کے ایک شاعر اعظم کو دعوت دی گئی تھی۔ سننے والوں پر اس کے زوال پذیر کلام کا اثر یہ ہوا کہ بعض نوجوانوں نے ایک خاص وضع اختیار کرنے کی ٹھان لی ہے۔ جس کے اساسی اجزا رندی اور رہبانیت ہیں۔ افسوس یہ ہے۔ کہ ان نوجوانوں میں چند ایسے خوش گو شعرا بھی شامل ہیں۔ جن کی مخلوقات ہنر میں مجھے صحت مندی اور توانائی کے آثار نظر آتے تھے ۔

ذرا اس نکتۂ نظر سے ہندوستان کے فنون لطیفہ پر نظر ڈالئے۔ شاعری کی حالت دیکھئے۔ اول تو غزل کے سوا اس میں گویا کوئی اور چیز پنپتی ہی نہیں۔ اور غزل کی حالت ہے۔ اس کے متعلق یہ

کہہ دینا کافی ہے۔ کہ تصوف اور مجبوریت کا پھیلایا ہوا زہر اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ اُردو غزل کی موجودہ شکل ہندوستانیوں کے فکر و سوز کا عکس نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کے عجمی تصور کے نکمے پن کا عکس ہے، ایرانی میلانات کا بے روح خاکہ ہے۔ غیروں کی محسوسات کا بے رنگ عکس ہے۔ تلخ حقیقتوں سے روگردانی، دنیائے فانی کی کہانی، گوشہ گیری اور خلوت گزینی کے راگ، فرسودہ مغربی رجحانات کے عکس یہی۔ آجکل کی غزل کے عناصر ہیں، آجکل غزل میں ایک انقلاب پیدا کرنے کی جو سعی کی جا رہی ہے کہ غزل ایک مسلسل خیال کا اظہار کرے۔ اس سعی کا ظاہری نتیجہ صرف یہ ہے کہ پہلے عجمیت کی سُست روی اور پست ہمتی کے آثار منتشر نظر آتے تھے۔ اب مسلسل غزلوں کے ذریعے ساقی، گلبانگ، سرود نغمہ موج بادہ سے خوب ہولی کھیلی جاتی ہے۔ مان لیا کہ غزل شاعر کی داخلی دنیا کے واردات کی تصویر ہے لیکن یہ کیا ستم ہے۔ کہ غزل گو کو نہ کبھی بھوک لگتی ہے۔ نہ وہ کم بخت بوڑھا ہوتا ہے۔ نہ اس بے حیا کو سوچ بچار کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ فرسودہ سُروں میں حسن اور عشق کا راگ الاپا جاتا ہے اور ہوس کاری کی ایک خیالی حسین دنیا پیدا کر کے خارجی دنیا اور خدا کی کائنات کی باقی تمام توانا مستیوں سے دل کو آزاد رکھتا ہے۔

اُردو غزل کے خیام اور حافظ ذرا سوچیں تو سہی۔ کہ خیام اور حافظ اپنے بیانات میں سچے تھے۔ آجکل کے غزل گوؤں کو وہ تن آسانیاں، اندھی جوانیوں کے لئے عشرت کوشی کے موقعے۔ وہ تربیت علم و فن وہ بادشاہانہ نوازشیں اور مجالس رنگین کہاں میسر آئیں، آرٹ زوال پذیر ہو۔ خیر ہو۔ کم از کم خلوص پر تو قائم ہو۔ ان بزرگواروں کے متعلق اقبال کا فیصلہ ہے ؎

ہے یہ فردوسِ نظر اہلِ ہنر کی تعمیر　　فاش ہے چشمِ تماشا پہ نہاں خانۂ ذات

نہ خودی ہے نہ جہاں سحر و شام کے دور | زندگانی کی حریفانہ کشاکش سے نجات
آہ وہ کافرِ بیچارہ کہ ہیں اس کے صنم | عصرِ رفتہ کے وہی ٹوٹے ہوئے لات و منات
تو ہے میّت یہ ہنر تیرے جنازے کا امام | نظر آئی جسے مرقد کے شبستاں میں حیات

ہندوستان کی کلاسکی موسیقی کی حالت اس سے بھی زیادہ دردناک ہے۔ دراصل ہندوستان کی موسیقی اصلاً جزوِ عبادت تھی۔ اور عبادت کا آریائی تصوّر (خصوصاً ہندوستانی) دیوتاؤں کے سامنے مسکنت اور عبودیت کا اظہار ہے۔ تقویتِ نفس کا ذریعہ نہیں ہے۔ اس لئے کلاسکی موسیقی کے تمام رموز و اسرار اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی کلاسکی موسیقی عہدِ قدیم کی زندگی کی ترجمان ہے جب انسان دیوی دیوتاؤں سے زیادہ قریب تھا۔ اس وقت کے انسان کے لئے دیوی دیوتا وہ تجریدی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ جو آج کل کے انسان کے لئے ہ

فطرت کے مظاہر دھوپ چھاؤں، بجلی، بادل، آگ کو وہ پُراسرار سمجھنے پر مجبور تھا۔ کیونکہ ابھی تک انسانی ذہن ان پر حکمراں نہ ہو سکا تھا۔ عام طور پر دیوتا انہیں قوتوں کے دیوتا تھے۔ انہیں قوتوں کی پُراسرار حرکت کے ساتھ ان کا تصوّر وابستہ تھا، اس وقت کا انسان مجبور تھا کہ اپنی موسیقی میں ان قوتوں کے سامنے عجز کا اظہار اور مسکنت کا اعتراف کرے۔ ہندوستان کی تمام کلاسکی موسیقی اور قدیم فنِ رقص دیوتاؤں کے ساتھ دست و گریباں ہے۔ اس کے تمام رموزِ خفی۔ اس کے تمام پُراسرار اشارے اس کے بھاؤ عموماً انسانی بےبسی، شکست، اور عاجزی یا دیوی دیوتاؤں کے روپ کی دلکشی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس موسیقی میں انسان خود ایک جزوِ حقیر ہے۔ راگ اور راگنی کی شکلیں دیکھئے۔ ایک قسم کا لطیف جمال تو ہے۔ لیکن جلال کا کہیں نشان بھی نہیں ہے۔ کہیں کوئی نازنین چمپا کے پھولوں کا ہار پہنے بین بجا

رہی ہے۔ کہیں کوئی جٹا دھاری جوگی گلے میں سانپ لپیٹے گیان دھیان میں مگن ہے۔ خود ان راگنیوں کا اثر دیکھیئے۔ کھماچ کی ایک خاص قسم کی شوخی، بہاگ کا سوز، کدارے کی رعنائی، پہاڑی کی دردانگیز سٹاس، سارنگ کا تیکھا پن سب کچھ ہے۔ نہیں ہے تو توانائی اور عالی حوصلگی نہیں ہے۔ عارفوں کے لئے یہ موسیقی محویت پیدا کرنے کا اچھا خوبصورت ذریعہ ہے۔ لیکن اس کلاسیکی خرافات کے رموز اور اشارے ہماری زندگی سے اس قدر دُور ہو چکے ہیں کہ جب تک ہم خود اس ماضی کے گزرے مُردوں کی طرح اپنی زندگی سے بیگانہ نہ ہو جائیں۔ جن کی زندگی کی یہ موسیقی ترجمانی کرتی ہے۔ اس وقت تک ہمیں کوئی لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔ کہیں کہیں عالمگیر اثرات کے اشارے کلاسیکی موسیقی میں موجود ہیں لیکن ان کے اظہار کے لئے باکمال مغنّی کی ضرورت ہے۔ اور آجکل کی فضا میں ایسے مغنیّوں کی موجودگی دشوار ہوتی جا رہی ہے ؂

یہ موسیقی زندگی کی کشمکش میں، خودی کی تکمیل میں، ذہن اور قلب کی بیداری میں تو کیا مفید ہوگی۔ البتہ غلاموں کو ایک خیالی دنیا کی خیالی مسرتوں کی افیون ضرور پلاتی ہے۔ اس قسم کی رجعت پسندانہ موسیقی کے متعلق اقبال کا فتویٰ ہے ؎

ناتوان و زار می سازد ترا ۔۔۔ از جہاں بیزار می سازد ترا

سوزِ دل از دل بُرد غم می دہد ۔۔۔ زہر اندر ساغرِ جم می دھد

اس کے برخلاف اقبال اس موسیقی کا خریدار ہے۔ جو فصل کاٹتے وقت کسان کی درانتی کی حرکت کو جانباز سپاہی کی تلوار کی طرح تیز کر دے۔ جو پوشیدہ قوتوں کو اُبھار کر آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے ایک نئی دنیا کے وجود کی خبر دے اور اس کی فتح کا مژدہ بھی سنائے ؂

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں ابھی اس موسیقی کو پیدا ہونا ہے۔ لیکن میں عرض کرونگا کہ پنجاب کے بعض گیت موضوع کی توانائی اور حیات پروری کے ساتھ، لفظوں کی ایک خاص ترکیب اور نفسِ مطلب کے اظہار کا ایک خاص انداز رکھتے ہیں۔ اور ان کو سن کر مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا ہے کہ پاکوبی اور دست افشانی کی صلاحیتوں کو ابھارنے کے علاوہ ان میں زندگی کے مسائل سے معرکہ آرا ہونے کی ترغیب بھی موجود ہے۔ مثلاً

جگّ جمیاں تے مانی گڑوِنڈیا

تے گھر گھر نین وے بھرے —— اوڑے —— اوڑے

تے جگ وی جوانی دے دن تھوڑے

اس گیت میں نہ صرف پنجاب کے ایک آتش نفس، تنومند جاٹ کی ہنگامہ پرور زندگی کی کہانی ہے۔ بلکہ جس طرح ہم اقتصادی طور پر کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ اس طرف نہایت لطیف اشارات ہیں۔ افسوس ہے۔ کہ یہ مضمون ان اشارات کی تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

اب اقبال کی زبانی سن لیجیے۔ کہ موسیقی کیسی ہونی چاہیئے ؎

نغمہ باید تُند رو مانندِ سیل ۔۔۔۔ تا برد از دل غمہاں را خیل خیل

نغمہ می باید جنوں پروردۂ ۔۔۔۔ آتشِ دل خونِ دل حل کردۂ

نغمہ گر معنی نہ دارد مردہ ایست

سوز او از آتش افسردہ ایست

کھل تو جاتا ہے مغنّی کے بم و زیر سے دل ۔۔۔۔ نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود

ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وہ نوا
جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود

جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمود

لفظوں کی تیز حرکت سے گرمئ حیات کے اشارے جس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ انکی بہترین مثال اقبال کی وہ نظم ہے۔ جو افغانوں کے حیات آفرین گیت "وا قربان" کی دھن میں لکھی گئی ہے ؎

رومی بدلے شامی بدلے بدلا ہندوستان
تو بھی اے فرزندِ کہستاں اپنی خودی پہچان

اپنی خودی پہچان۔ او غافل افغان!

موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان

اپنی خودی پہچان۔ او غافل افغان!

اونچی جس کی لہر نہیں ہے۔ وہ کیسا دریا
جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان

اپنی خودی پہچان۔ او غافل افغان!

کلاسیکی رقص بھی موسیقی کی طرح دیوتاؤں کی خدمت میں ہدیۂ نیاز ہے۔ بدھ نے اپنی تعلیم و تبلیغ کے سلسلے میں جو وعظ کئے ہیں۔ ان کے دوران میں ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کی حرکت سے بھی کام لیا ہے۔ قدیم رقص کے ماہروں نے ان اشارات کے معانی و رموز کو ایک باقاعدہ آرٹ بنایا اور اپنے بدن کے پیچ و خم کی بنیاد ان اشاروں پر رکھی یا پھر ہندو دیومالا کی بعض خوبصورت روایات کو رقص کا جامہ پہنانا چاہا۔ یہ فن بھی ہماری زندگی کے تمام مسائل سے پرے ہٹ کر بے جان، بے کار اور بے سوز ہو گیا ہے۔ نہ اس رقص کی حرکات میں زندگی ہے۔ نہ ایسے معانی جن کے

رموز سے ہم اچھی طرح لطف اندوز ہوسکیں۔ رقص کرنے والوں کے ہاتھوں اور پاؤں کی حرکات اور بدن کے پیچ وخم کے دائرے بغیر کسی تنوع کے اپنی شخصیت کے اظہار کے اقلیدسی شکلوں کی طرح ایک بندھے ہوئے قانون کی پیروی کرتے ہیں یہ سچ ہے کہ بعض بالینی رقاص اپنے رقص میں پرانی روایات کو ایسا جامہ پہنا سکتے ہیں۔ کہ ہماری زندگی کے بنیادی مسئلوں کا رنگ ان میں جھلکنے لگے۔ لیکن ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔ اقبال کہتا ہے ؎

چھوڑ یورپ کیلئے رقص بدن کے خم و پیچ   روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم اللہی
صلہ اس رقص کا ہے تشنگیٔ کام و دہن   صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی

ہندوستان مصوری کی خیالی دنیا موسیقی کی افسوں پرور دنیا سے بھی زیادہ بے جان اور بے صدا ہے۔ شروع ہی سے اسلام میں مصوری کے ابتدائی نقوش شام اور عراق عرب کے ان صناعوں کی کوششوں سے متاثر ہوگئے تھے۔ جو زوال پذیر بازنطینی آرٹ کے نقال تھے۔ یہ نقل کے نقل کرنے والے مصور اسلامی موضوعات میں عیسائیت اور مجوسیت کے اشارات پیدا کرنے میں بڑے باکمال تھے۔ ایران نے ان لوگوں سے اور ان نقالوں سے اگر کچھ ورثے میں لیا ہوگا تو وہ تصنع کے سوا کیا ہوگا۔ جب سلطان حسین کے دربار میں ایرانی مصوری کا احیا ہوا تو بہزاد نے ڈیزائن کی خوبصورتی رنگوں کی دلفریب ملاوٹ سے ان تصاویر کو فروغ دیا۔ جو درباری زندگی کے معمولی واقعات کا مرقع تھیں۔ یا ایران کے لالہ زاروں میں یارانِ ہم مشرب کی سرمستیوں کی ترجمان۔ جب ہمایوں ایران سے اس آرٹ کا قلم لے کر ہندوستان آیا، تو مغل مصوری بھی درباری زندگی کا مرقع ہو کر رہ گئی، فرق یہ تھا کہ ایران کی مصوری میں چہرے عموماً جذبات سے معرا ہوتے تھے۔ لیکن مغل مصوروں نے کردار کشی میں

جذبات نگاری کی ضرورت بھی محسوس کی، ان میں سے بعض جانوروں کی تصویریں خاص طور پر استاد منصور کے نقوش اور بعض شاہی دعوتوں اور جلسوں کے مرقعے نہایت دلفریب ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مغل مصوّری دربار کے محدود حلقے سے کبھی باہر نہیں نکلی، اور نہ اسے کبھی عوام کے جذبات کی ترجمانی کا موقع ملا۔

راجپوت سکول کے مصوّروں نے مغل مصوّری کی وجدیت اور رنگ آمیزی کے مقابلہ میں ایک اور انداز کو فروغ دیا۔ جس کو بعض انگریز نقاد Lyrical کا لقب دے کر اس کی رجعت پسندی کو چھپانا چاہتے ہیں۔ ان مصوروں نے عام طور پر اجنتا کی دیواری تصویروں سے سبق لینے کی بجائے جو سماج کی حقیقتوں کی ترجمانی کرتی تھیں اپنا منہ ہندو دیو مالا کی طرف کر لیا اور جو کلاسیکل موسیقی میں ہوا تھا مصوّری پر بھی وہی ہونے لگا، کرشن اور رادھا کی محبت کے مرقعے، دیو مالا کی روایات کے نقوش، راگ اور راگنیوں کی شکلیں اس سکول کے خاص موضوع ہیں۔ ہمارے آرٹ میں یہ جو واپس جانے کی، زندگی سے گریز کرنے کی ایک خیالی دنیا میں رہنے کی خو پائی جاتی ہے۔ وہ مصوّری میں کیوں نظر نہ آتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آج تک ہماری مصوّری چند خاص موضوعات سے باہر نہیں نکلی ہے۔ کوئی مغل مصوّری کی رنگ آمیزی کا شیدا ہے۔ کوئی راجپوت سکول کی بھگتی کا خریدار لیکن عوام الناس کی زندگی سے مصوری کو قریب تر لانے کی کوئی کوشش نہیں ہوتی وہی معرفتی اور مذہبی رجحانات جو موسیقی میں ہیں مصوّری میں بھی عمل پیرا ہیں وہی فقیروں، خانقاہوں، مرقدوں، سادھوؤں کے مرقعے، وہی مذہبی روایات کے عکس، وہی خواب آلود دنیاؤں کے دھندلکے، وہی خیالی زمین و آسمان ہماری مصوّری کی زندگی سے اس بیگانگی کی طرف اقبال نے ان اشعار میں اشارہ کیا ہے ؎

را ہبے درحلقۂ دامِ ہوس   دلبرے با طائرے اندر قفس
نازنینے وررہِ بُت خانۂ   جو گئے درخلوتِ ویرانۂ
نوجوانے ازنگاہے خوردہ تیر   کودکے برگردنے بابائے پیر
می چکد از خانہ ہا مضمونِ موت   ہر کجا افسانہ وافسونِ موت

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیّل   ہندی بھی فرنگی کا مقلّد، عجمی بھی
مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد   کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی
معلوم ہیں اے مردِ ہنر تیرے کمالات   صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تُو نے
آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

فنِ تعمیر کے متعلق میں کچھ نہ کہوں گا۔ کیونکہ یہی ایک فن ہے جسے مسلمان منتہائے کمال تک پہنچا چکے ہیں۔ اور اس کے متعلق ایک بسیط مضمون لکھ رہا ہوں۔ حضرات! اب اس سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں اور اقبال کے چند شعر پڑھ کر رخصت ہوتا ہوں۔ خدا ہمارے اہلِ ہنر کو ان پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے

یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا!
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!



محمد نصیر ہمایوں نے اتحاد پریس نپل روڈ لاہور میں محمد امین پرنٹر کے ذریعہ چھپوا کر قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور سے شائع کیا۔

اراکین انٹر کالجئیٹ مسلم برادر ہڈ و ادبا، کرام

بر تقریب "یوم اقبال" ۹ جنوری سنہ ۱۹۳۸ء

(دائیں سے بائیں) بیٹھے اصحاب :- عبدالحفیظ خاں (فنانشل سکرٹری) ابراہیم علی چشتی (سکرٹری) - جاوید اقبال - غلام محمد - محمد شفیع (صدر)

کرسیوں پر :- پروفیسر منیر الدین - مولانا جلال الدین اکبر - راجہ حسن اختر - مولانا حامد علی خاں حامد - میاں بشیر احمد - خواجہ غلام السیدین

حضرت مولانا اسلم جیراجپوری - چودھری غلام احمد پرویز - حضرت آسد ملتانی - سید نذیر نیازی - پروفیسر گوربچن سنگھ

پروفیسر عابد علی عابد +

کھڑے اصحاب پہلی صف } خواجہ مسلم - اثیری - بشیر احمد - عبدالحق - الطاف حسین شوکت (سکرٹری اقبال کمیٹی) - علی محمد خادم - صوفی صاحب - شیخ سراج الحق

مولانا محمد اشرف - حضرت حفیظ ہوشیارپوری - ڈاکٹر عبدالحمید ملک - چودھری محمد حسین - مشتاق احمد - شجاع +

آخری صف :- ابراہیم ماں - خورشید اختر - عبدالرزاق - انوار - ہدایت اللہ سحر

